آٹھواں خطبہ

تزکیہ اور احسان

تزکیہ اور احسان کو ہمیشہ ہر مذہب اور ہر مذہبی پیغام میں ایک بنیادی ضرورت سمجھا گیا اور روحانی پاکیزگی کو مذہبی زندگی کا ایک اہم بلکہ سب سے اہم مقصد قرار دیا گیا۔ مذہب اور روحانی پیغام کا اصل مقصد انسان کے نفس، دل اور روح کا تزکیہ ہے۔ انسان اپنے دل اور روح کی گہرائیوں سے اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو، خالق کے احکام پر چلنے کا داعیہ دل کے اندر سے پیدا ہو، ہر وقت خالق کے حضور جوابدہی کا احساس بیدار رہے اور بالآخر خالق سے ملاقات اور خالق کے حضور پیشی کا ایک دائمی شوق واشتیاق ہو، یہ کیفیت پیدا کرنا ہر مذہب کا، ہر آسمانی کتاب کا اور اللہ تعالیٰ کے ہر نبی ﷺ کا بنیادی ہدف اور مقصد رہا ہے۔

عبادات اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہیں۔ تقویٰ اسی مقصد کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ اور منزل ہے۔ شریعت کے تمام احکام اسی یقین اور اطمینان کو قائم کرنے، قائم رکھنے اور مزید پختہ کرنے کے لیے ہیں۔ لیکن تزکیہ واحسان کی اس اہمیت کے باوجود کہ یہ ہر مذہب کی پہلی اور ابتدائی ضرورت ہے اکثر مذاہب کے ماننے والوں میں تزکیہ واحسان کے باب میں افراط وتفریط کا رویہ پیدا ہو گیا۔ بعض قدیم مذاہب میں ترک دنیا اور رہبانیت کا داعیہ پیدا ہوا، بعض دیگر مذاہب میں تزکیہ اور احسان کے انتہائی لطیف اور گہرے روحانی احساسات کو جب کتابی شکل میں مدون کیا گیا تو اس عمل میں بالتدریج ایسے عنصر کی آمیزش ہو گئی جو تزکیہ واحسان کی لطافت اور پاکیزگی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں تھا۔

مسیحی تصوف میں، ہندوؤں کے ہاں رائج روحانی تصورات میں فلسفے کی اتنی گہری آمیزش ہو گئی کہ تصوف ایک فلسفہ بن کر رہ گیا۔ اس سے دنیا کی بہت سی اقوام متاثر ہوئیں، خود مسلمان صوفیاء میں بعض حضرات دانستہ یا نادانستہ ان تصورات اور خیالات سے متاثر ہوئے

اور یوں ایک زمانہ ایسا آیا کہ روحانیات اور وجودی فلسفے، روحانی پاکیزگی اور باطنیت، اللہ کے حضور جوابدہی کا گہرا قلبی احساس اور احکام شریعت سے فرار کا رویہ، یہ سب امور ایک دوسرے کے ساتھ قریب قریب لازم وملزوم کی حیثیت اختیار کر گئے۔

اسلام میں روحانیات کا آغاز روزِ اول ہی سے ہو گیا تھا، روزِ اول سے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کی یہ تربیت فرمائی کہ جہاں وہ شریعت کے ظاہری احکام پر عمل کریں، جہاں وہ شریعت کے ان احکام پر عمل کریں جن کا تعلق انسان کے اعضاء اور جوارح سے ہے، جن کو بعد میں فقہ کا نام دیا گیا، وہاں وہ شریعت کے قلبی احکام پر بھی عمل کریں، اللہ کے حضور جوابدہی کا احساس، تزکیہ نفس، احسان اور دوسری اعلیٰ اور برتر روحانی کیفیات ان کو حاصل ہوں۔ جن برائیوں سے، جن ناپسندیدہ قلبی احساسات سے شریعت نے بچنے کا حکم دیا ہے ان سے بچیں، جن اچھائیوں یا قلبی احساسات کو شریعت نے پسندیدہ قرار دیا ہے ان کو اپنائیں۔

صحابہ کرامؓ اور تابعین کے زمانے تک یہ انتہائی پاکیزہ اور ستھرا سرچشمہ ہدایت جاری رہا۔ قومیں اور نسلیں ان سے فیض یاب ہوئیں، دنیا کے ملکوں تک، مختلف براعظموں تک اس کی برکات وثمرات پہنچے۔ جب تیسری چوتھی صدی ہجری کے زمانے میں مختلف اسلامی علوم وفنون کی تدوین کا کام شروع ہوا، اور اسلام کی تعلیم وہدایت کے مختلف پہلوؤں کو الگ الگ مرتب کرنے کا کام آگے بڑھا، اس وقت اس بات کی بھی ضرورت محسوس ہوئی کہ تصوف کے احکام اور تزکیہ واحسان کی تعلیم کو بھی مرتب ومدون کیا جائے۔ چنانچہ اس مبارک کام کا آغاز حضرات محدثین کے ہاتھوں ہوا، متعدد محدثین نے زہد اور رقاق کے موضوع پر کتابیں تیار کیں، احادیث کے مجموعے مرتب کیے۔ ان کاوشوں کا مقصد یہ تھا کہ انسان کے دل میں مادیات کی محبت، اور دنیا سے غیر ضروری دلچسپی اور اہتمام کے جذبات کو کم کیا جائے، آخرت کی جوابدہی کے احساس کو مزید پختہ کیا جائے اور اللہ کے حضور پیشی کی یاد کو ہمیشہ دلوں میں تازہ اور بیدار رکھا جائے۔ چنانچہ حضرت امام احمد بن حنبل، حضرت امام عبداللہ بن مبارک اور دوسرے متعدد حضرات نے زہد واستغناء کے موضوع پر کتابیں تصنیف فرمائیں۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا تزکیہ واحسان کے متعلق اسلام کے احکام کو علمی انداز میں مرتب کرنے کی کاوشیں بھی جاری رہیں۔ دوسری طرف جیسے جیسے اسلامی ریاست پھیلتی گئی مسلمانوں

کی سیاسی قوت میں اضافہ ہوتا گیا اور اس کے نتیجے میں مادی آسائشوں کی بہتات ہوئی، تو بعض سعید روحوں نے یہ محسوس کیا کہ مادیات کے اس بڑھتے ہوئے غلبے سے کہیں مسلمانوں کی روحانی اقدار لوگوں کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں، کہیں دولت کی اس فراوانی کے نتیجے میں عامۃ الناس یادِ الٰہی سے غافل نہ ہو جائیں، کہیں وسائل کی اس بہتات کی وجہ سے لوگوں کی توجہ اصل دینی حقائق سے ہٹ کر دنیاوی مفادات پر مرکوز نہ ہو جائے، اس لیے کچھ حضرات نے خاص طور پر آخرت کی یاد دہی، مادیات سے بیزاری، اور دنیا سے دل لگانے کے عمل کو ناپسندیدہ قرار دینے کی کاوشوں کا آغاز کیا۔

اس طرح بالتدریج ایسے حضرات دوسرے اہل علم و دعوت سے ممیّز ہوتے گئے جن کی زندگی کا خاص مقصد یہ تھا کہ عامۃ الناس کے دلوں میں اللہ کی محبت کو تازہ کریں، مادیات میں انہماک سے ان کو روکیں، دنیوی نعمتوں اور مال و دولت کی فراوانی کے اخلاقی اور روحانی منفی نتائج سے ان کو آگاہ کریں۔ ایسے حضرات کثرت سے دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی ہجری کے اوائل میں سامنے آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ حضرات تھے جن کا معاشرے میں غیر معمولی احترام اور مقام تھا، بڑے بڑے محدثین، امام احمد بن حنبل، امام یحیٰ بن معین جیسے بزرگ ان شخصیتوں کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، حضرت حاتم اصم جو امام احمد کے مشہور معاصر اور ان کے قریبی دوست تھے، وہ اسی طرح کی ایک شخصیت تھے۔ حضرت ابراھیم ادہم اسی طرح کی ایک شخصیت تھے، حضرت بشر الحافی ایسے ہی با خدا بزرگ تھے۔ کچھ اور حضرات بھی تھے، انہی حضرات میں ایک ابن ابی الدنیا تھے جن کی بہت سی تصانیف ہیں۔

ان حضرات نے یہ بیڑا اٹھایا کہ محدثین، متکلمین اور فقہاء کی علمی مساعی اور فکری کاوشوں کے ساتھ ساتھ شریعت کے تیسرے پہلو، یعنی اخلاق اور تزکیہ اور مسلمانوں کی روحانی تربیت کے پہلو پر بھی پوری توجہ دیں اور عامۃ الناس کی ذہنی، عقلی اور فکری تیاری کے ساتھ ساتھ ان کو روحانی تربیت بھی فراہم کریں۔ اس طرح روحانیات کے علم کا ایک مرتب اور باقاعدہ آغاز ہوا، جس کو صدرِ اسلام میں ہی تصوف کا نام دیا گیا، روحانیات اور اخلاقی تربیت کے اس عمل سے وابستہ حضرات عامۃ الناس میں صوفی کے لقب سے مشہور ہوئے، یعنی وہ زاہد پشمینہ پوش جو مادیات سے بالاتر رہ کر زندگی گزار سکتے ہوں، جن کی زندگی کا واحد مقصد

عامۃ الناس کو اللہ اور اس کے رسول کی محبت اور شریعت سے وابستہ رہنے کی تلقین کرنا ہو۔ یہ حضرات بہت جلد معاشرے میں غیر معمولی احترام اور عقیدت کا مرکز بن گئے، عامۃ الناس کی بڑی تعداد نے ان کی طرف رجوع کیا۔

انسانی معاشرے کا خاصہ یہ رہا ہے کہ جب انسانی معاشرے میں کسی چیز کا چلن ہوتا ہے تو جہاں اس کے حقیقی علمبردار عزت و احترام اور تکریم کے مستحق قرار پاتے ہیں، وہاں اس عزت و تکریم کی خاطر اس گروہ میں بعض ایسے لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو دراصل اس پیغام کے حقیقی نمائندہ نہیں ہوتے، ان کا مقصد محض شہرت حاصل کرنا، یا عامۃ الناس میں عزت حاصل کرنا یا اس طرح کے دوسرے مادی یا دنیوی مقاصد ہوتے ہیں۔ یہ ہر میدان میں ہوتا رہا ہے، محدثین کے ساتھ بھی ہوا ہے، جہاں بڑے بڑے محدثین تھے، وہاں ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے علم حدیث کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے فائدہ اٹھا کر اپنے کو نمایاں کرنا چاہا، مفسرین میں بھی ایسے لوگ تھے، فقہاء میں بھی تھے۔ اس لیے تصوف میں اگر ایسے لوگ آ کر شامل ہو گئے ہوں تو یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔

تصوف کے نام سے بہت سے لوگوں نے کاروبار چلانا چاہا، ان میں خالص مادہ پرست اور مادی مفادات سے دلچسپی رکھنے والے لوگ بھی تھے، مادی مفادات سے دلچسپی رکھنے والوں کے ساتھ ساتھ اس طبقے میں باطنیت اور اسماعیلیت کے علمبردار بھی تھے جو اس طبقے کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے فائدہ اٹھا کر اپنے خیالات اور تصورات کو تصوف کے نام سے مسلمانوں میں پھیلانا چاہتے تھے، یوں تصوف میں غیر اسلامی امور کی آمیزش شروع ہو گئی۔ اب ضرورت اس بات کی محسوس ہونے لگی کہ تصوف میں جن غیر اسلامی امور کی آمیزش ہو گئی ہے ان کو الگ کیا جائے، تصوف اور تزکیہ کی اصل روح کو قرآن مجید اور سنت کی روشنی میں واضح کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح تصوف کے بڑے بڑے نمائندہ اہل علم سامنے آئے، جنھوں نے قرآن و سنت کی متعلقہ تعلیم کو، بڑے بڑے اصحاب تزکیہ و احسان کے خیالات کو اور اپنے تجربات و مشاہدات کو تحریری شکل میں مدون کرنا شروع کیا۔ کچھ حضرات ایسے ہیں جنھوں نے خود تو کوئی کتاب تصنیف نہیں کی لیکن ان کے اقوال اتنے کثرت سے منقول ہیں کہ ان کی روشنی میں تصوف کے بارے میں ان کے تصورات کا واضح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت

حسن بصری، جنید بغدادی، حضرت حاتم اصم، بشر الحافی، ابراہیم الادہم، اور ان جیسے بہت سے حضرات کے خیالات تصوف کی قدیم کتابوں میں کثرت سے ملتے ہیں۔ اور ان کی بنیاد پر ایک واضح تصور قائم کیا جا سکتا ہے کہ ان حضرات کی نظر میں تصوف اور تزکیہ سے کیا مراد ہے۔

پھر جیسے جیسے وقت آگے بڑھا ابونصر سراجؒ، ابوطالب مکیؒ، امام ابوالقاسم قشیریؒ وغیرہ نے اس خالص دینی علم کو باقاعدہ علمی طور پر مرتب کیا۔ پھر آگے چل کر امام غزالیؒ، شیخ عبدالقادرؒ جیلانی، اور ہمارے برصغیر میں حضرت شیخ علی ہجویری، مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور دوسرے بہت سے حضرات نے تصوف کی تعلیمات کو علمی اور تصنیفی شکل دینے کی کوشش کی۔ یہی حضرات تصور کے بڑے بڑے نمائندہ ہیں۔ تصوف کیا ہے؟ تصوف کیا نہیں ہے؟ یہ جاننے کے لیے انہی حضرات کی تحریریں اور کتابیں دیکھنی چاہئیں۔

تصوف کے مستند نمائندگان نے لکھا ہے کہ صوفیاء کے تذکرے، غیر مستند ملفوظات کے مجموعے اور صوفیاء سے منسوب حکایات تصوف کی تعلیمات یا احکام کا مأخذ نہیں ہیں۔ تصوف کی تعلیم اور احکام کا مأخذ قرآن وسنت کے احکام اور شریعت کے اصول ہیں، اور اس کے بعد ان ذمہ دار حضرات کے، جن کا تعلق تابعین اور تبع تابعین کے زمانے سے تھا، اقوال اور فرمودات ہیں، اور سب سے آخر میں یہ علمی کتابیں آتی ہیں جو اہل علم نے مرتب کی ہیں۔ یہ سب حضرات جنھوں نے تصوف پر مستند کتابیں تیار کیں۔ مثلاً ہمارے برصغیر کے شیخ علی ہجویریؒ، خراسان کے امام ابوالقاسم قشیریؒ، امام غزالیؒ، اور جنوبی ایشیا کے منفرد عبقری حضرت مجددِ الف ثانیؒ، یہ سب حضرات دنیائے علم میں بھی اونچا مقام رکھتے ہیں اور تصوف کی تعلیمات کو بیان کرنے میں بھی انہوں نے اسی عالمانہ مقام کو برقرار رکھا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تصوف کے سلسلے وجود میں آ گئے، ہر بڑے صاحب تزکیہ کا ایک منفرد طرز تربیت تھا۔ یہ ایک فطری سی بات ہے کہ ہر اسلوب تربیت کے نتیجے میں جب طلبہ کی ایک جماعت تیار ہو گی، تربیت یافتہ نسل سامنے آئے گی، تو اس کے نتیجے میں ایک مکتب فکر خود بخود وجود میں آئے گا۔ چنانچہ جس طرح تفسیر میں، حدیث میں، فقہ میں، علم کلام میں مکاتب فکر وجود میں آئے، اسی طرح تصوف میں بھی مکاتب وجود میں آئے جن کو طریقہ یا سلسلہ کہا گیا۔

برصغیر ہندوپاکستان، افغانستان، ترکی، ایران وغیرہ میں یہ مکاتب فکر سلسلہ کے نام سے

جانے جاتے ہیں۔ بعض اور ممالک میں مثلاً عرب دنیا میں اور کسی حد تک ترکی میں ان کو طریقہ یا تکیہ کا نام دیا گیا ہے۔ یہ وہ مکاتب فکر ہیں جن کا تعلق تربیت کے طریقوں سے اور تربیت کے دیگر امور سے ہے، روحانی تربیت کے ان معاملات سے ہے جن میں بعض قابل احترام مربی حضرات نے تربیت کے نئے نئے اصول دریافت کیے ہیں۔ یہ سلسلہ طویل عرصے تک جاری رہا۔ بعض صوفیانہ سلسلوں کو بعض علاقوں میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی، انہوں نے وہاں امتِ اسلامیہ کی دینی تربیت کی، اس کی دینی وحدت کو برقرار رکھنے میں مدد کی، عامۃ الناس کی روحانی تربیت کا فریضہ انجام دیا اور نہ صرف روحانیات کے باب میں، نہ صرف تربیت اور تعلیم کے باب میں، بلکہ اصلاح معاشرہ، جہاد اور اصلاحی کوششوں کے باب میں بھی ان حضرات کی کوششیں بہت نمایاں ہیں۔

ماضی میں جتنے بڑے بڑے سلاسل تصوف تھے وہ سب کسی نہ کسی حیثیت سے، کسی نہ کسی سطح پر دعوت و تبلیغ اور جہاد کے عمل میں ہمیشہ شریک رہے ہیں۔ بڑے بڑے اصحاب تزکیہ جہاد کے معاملے میں بھی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ مجاہد صوفیاء کی ایک بہت بڑی تعداد اسلامی تاریخ میں ہمیشہ موجود رہی ہے اور، ہر دور میں موجود رہی ہے۔ دور جدید آتے آتے ان میں سے بہت سے سلسلے کمزور پڑ گئے، بعض جگہ صرف روایات قائم رہ گئیں، اصل روح بالتدریج کمزور ہوتی گئی، خاص طور پر مغربی استعمار کے آنے کے بعد جب جہاد کی کوششیں ناکام ہوئیں تو مسلمان بحیثیت مجموعی ایک حد تک مایوسی کا شکار ہوئے اور انہوں نے وہ اصلاحی اور دینی کوششیں ترک کر دیں، جن کا تعلق مغربی استعمار سے نجات حاصل کرنے سے تھا۔ اسی زمانے میں تصوف کے سلسلے بھی بے عملی کا شکار ہوئے اور وہ محض ایک روایت یا میراث کے، ایک تاریخ کے علمبردار بن کر رہ گئے۔ جن کے بارے میں علامہ اقبال نے کئی جگہ بہت شدید الفاظ میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہم جب قدیم صوفیانہ مراکز کے ان بزرگوں کا جن کے نام سے وہ مرکز وابستہ ہیں، ان کے آج کے جانشینوں سے مقابلہ کرتے ہیں تو، ظاہر ہے زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ علامہ اقبال نے جا بجا اس فرق کی نشاندہی کی ہے اور یہ یاد دلانے کی کوشش کی ہے کہ ارباب تصوف کو اپنے سابقہ فرائض یاد رکھنے چاہئیں، اپنی ذمہ داریاں نہیں بھولنی چاہئیں اور اپنے بزرگوں کی ان حقیقی روایات کو زندہ کرنا چاہیے جن کے وہ

علمبردار تھے۔

تصوف کے بارے میں یہ تمہیدی گفتگو اس خطبے کی تمہید ہے جس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ تزکیہ و احسان کے بارے میں اسلام کی تعلیم کیا رہی ہے، مسلمانوں میں روحانیات کا آغاز کیسے ہوا، تصوف کی ترتیب و تدوین کیسے ہوئی اور تصوف کے بڑے بڑے نمائندگان کے خیالات، تصورات اور نظریات کیا ہیں؟ گفتگو کے آخر میں دور جدید میں تصوف کے احیاء کی بعض کوششوں کے بارے میں ایک دو مختصر اشارات بھی کیے جائیں گے۔

شریعت کی تعلیم کا یہ وہ بنیادی پہلو ہے جس کو عرف عام میں ''قلبی اصلاح'' یا اندرونی اصلاح کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے۔ شریعت کی تعلیم کے اس پہلو کے لیے اسلامی تاریخ میں بہت سی اصطلاحات استعمال ہوئیں۔ اس کے لیے قرآن مجید میں تزکیہ کی اصطلاح متعدد مقامات پر استعمال ہوئی ہے اور ایک مشہور حدیث میں احسان کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ یوں ان دونوں بابرکت کلمات کو یکجا کر کے تزکیہ و احسان کی اصطلاح اختیار کی جاسکتی ہے۔ تزکیہ و احسان یا انسان کی روحانی تربیت اور داخلی اصلاح ایک ایسا موضوع ہے جو روز اوّل سے، تابعین اور تبع تابعین کے زمانے سے، نہ صرف عملی بلکہ علمی دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔ گزشتہ سوا چودہ سو سال میں اس موضوع پر اسلام کی تاریخ کے بہترین دماغوں نے غور کیا ہے، اور جید ترین اور بلند ترین کردار کے انسانوں نے ان موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس موضوع پر اہل علم نے جہاں خالص علمی اور دینی نقطۂ نظر سے غور و خوض کیا، وہاں ہزاروں اہل علم و فکر نے اپنی تجاویز، تحقیق اور تجربات و واردات کو تحریری شکل میں بھی مرتب کیا ہے۔

دوسرے موضوعات کے مقابلے میں یہ موضوع نسبتاً مشکل ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک ایسا پہلو ہے کہ جس کا تعلق دیگر اعضاء کے مقابلہ میں انسان کے دل سے زیادہ ہے۔ یہ پہلو خالص تجربہ، اخلاقی رویہ اور قلبی احساس سے زیادہ تعلق رکھتا ہے اور گفتار سے اس کا تعلق کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روحانی احساسات اور قلبی واردات انتہائی لطیف اور ناقابل بیان تجربہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کو تحریر کا جامہ پہنانا آسان کام نہیں۔ تزکیہ و احسان کا مقصد انسانوں کے کردار کی اصلاح کرنا ہے، کردار کی اصلاح کے لیے افکار کی اصلاح ناگزیر ہے۔

تزکیہ و احسان وہ میدان ہے جہاں گفتار کی گنجائش کم سے کم ہوتی ہے۔ لہذا ایک ایسے

طالب علم کے لیے جس کا میدان صرف گفتار ہو، افکار کے بارے میں بات کرنا تو کسی حد تک آسان ہے۔ لیکن کردار اور وہ بھی قلبی کردار اور دلی احساسات کے بارے میں بات کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے میری یہ گفتگو صرف ان تحریروں تک منحصر ہوگی جو اس موضوع کے جید ترین اہل علم نے مرتب کی ہیں اور جو مشرق و مغرب میں، دنیائے اسلام کے قدیم و جدید ادوار میں، اس میدان کے فارس اور شاہسوار سمجھے گئے ہیں، جن کی تحریریں، جن کے نتائج فکر اور جن کے خیالات نے انسانوں کی بہت بڑی تعداد کو متاثر کیا ہے، اور آج بھی ان کے افکار و خیالات، نہ صرف مشرق میں بلکہ مغرب میں بھی نہایت اہمیت اور دلچسپی کے ساتھ پڑھے جا رہے ہیں اور انسانوں کی روز افزوں تعداد کو متاثر بھی کر رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ اس مضمون کے مشکل ہونے کا ایک سبب اور بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس میدان میں جہاں اسلام کے جید ترین مفسرین اور ترجمانوں نے اپنے غور و فکر، مطالعہ اور تجربہ کے نتائج مرتب فرمائے، وہاں اس موضوع کی اصطلاحات کو بعض حضرات نے غلط مفہوم بھی دیا، کچھ لوگوں نے اخلاص سے، لیکن کم فہمی سے ایسا کیا۔ کچھ لوگوں نے اخلاص اور بدفہمی سے، اور کچھ لوگوں نے بدنیتی اور غلط عزائم سے غلط نتائج نکالنے کے لیے ان اصطلاحات کا غلط استعمال بھی کیا۔ ان اصطلاحات کا غلط استعمال کرنے سے ایسے بدنیت اور بدعقیدہ لوگوں کا مقصد بعض ایسے مقاصد کی تکمیل تھا جو اسلام یا شریعت کے مقاصد نہیں تھے۔ چنانچہ باطنیوں، قرامطہ اور اسمٰعیلی مبلغین نے وسیع پیمانہ پر یہ کام کیا اور اصطلاحات تصوف کے پردہ میں اپنے خیالات سادہ لوح مسلمانوں میں پھیلا دیے۔ ان دو بڑی مشکلات کے باوجود میری کوشش ہوگی کہ تزکیہ و احسان کے موضوع پر اسلامی تاریخ کے جید ترین اہل علم اور اس میدان کے مستند ترین ترجمانوں نے جو لکھا ہے اس کا خلاصہ آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

سب سے پہلی بات جو اکابر صوفیہ نے انسان کی اصلاح اور تربیت کے ضمن میں محسوس کی اور جس کو انھوں نے انسانوں کی داخلی اصلاح میں پیش نظر رکھنا ضروری سمجھا وہ یہ ہے کہ انسان کا وجود ایک نہایت جامعیت رکھنے والا وجود ہے۔ اللہ کی تمام مخلوقات میں انسان وہ واحد مخلوق ہے جس کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا کہ اس میں اللہ نے اپنی روح پھونکی۔ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ ۔ اور اس کو اپنے Image پر پیدا کیا۔ اِن الله خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی

صُورتہ۔ یہاں صورت سے کیا مراد ہے، روح سے کیا مراد ہے؟ اس کی بہت سی تفسیریں اور تعبیریں ہوئی ہیں۔ لیکن ان تمام تفسیروں اور تعبیروں میں جو بات قدر مشترک ہے وہ یہ ہے کہ انسان کا وجود اتنا پیچیدہ اور اتنا غیر معمولی ہے کہ کائنات میں کسی اور مخلوق کا وجود اتنا پیچیدہ اور غیر معمولی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو کما حقہ سمجھنا جتنا مشکل ہے دوسری مخلوقات کو سمجھنا اتنا مشکل نہیں ہے۔

خالق کائنات کے بعد کائنات کا سب سے محترم وجود انسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے مختلف پہلوؤں پر اور انسانی زندگی کے مختلف گوشوں پر فلاسفہ اور مفکرین ہزار ہا ہزار سال سے غور کرتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن آج تک کوئی یہ نہیں کہہ سکا کہ فلاں نظام فکر نے یا فلاں فلسفی یا فلاں فلسفہ نے انسان کو اس طرح سمجھ لیا ہے جس طرح کہ سمجھنے کا حق ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مفکرین اسلام نے لکھا تھا کہ جو شخص اپنے آپ کی معرفت حاصل کر لے اس کے لیے اللہ کی معرفت حاصل کرنا مشکل نہیں ہے۔ **من عرف نفسه فقد عرف ربه**۔ اگرچہ اس جملے کو بھی غلط تعبیر کا نشانہ بنایا گیا، لیکن یہ جملہ کہنے والوں کا مقصد صرف اتنا ہی تھا کہ انسان کا وجود انتہائی غور و خوض کا متقاضی ہے، اس کی حقیقت اور کنہ کو جاننے کے لیے بہت غیر معمولی غور و فکر کی ضرورت ہے اور جب اپنی ذات اور دیگر حقائق کائنات میں وہ غور و فکر کرنے کا انسان عادی ہو جائے، تو خالق کائنات کی عظمت کا احساس ہونے لگتا ہے اور اللہ رب العزت کی قدرت و عظمت کے لامحدود اور لامتناہی ہونے کا کسی حد تک اندازہ اس کو ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید سے پتا چلتا ہے کہ انسان کی تمام سرگرمیوں کا دار و مدار، کامیابی اور ناکامی دونوں صورتوں میں، اس کے قلب کے استقرار اور روح کی پاکیزگی پر ہے۔ انسان کے قلبی احساسات اور روحانی جذبات و عواطف اس کی زندگی کو کامیاب بھی بناتے ہیں اور ناکام بھی بنا سکتے ہیں۔ اگر یہ جذبات اور احساسات صحیح خطوط پر کام کر رہے ہوں تو انسانی زندگی کامیاب رہتی ہے اور اگر یہ جذبات و احساسات صحیح خطوط پر کام نہ کر رہے ہوں تو انسانی زندگی تمام ظاہری اور مادی کامیابیوں کے باوجود، تمام وسائل کی بہتات اور اسباب کی فروانی کے باوجود، ناکام ہو سکتی ہے اور ہزاروں مرتبہ ناکام ہوئی ہے۔

یہ وہی بات ہے جس کو ایک مشہور حدیث میں حضور علیہ السلام نے یوں بیان فرمایا ہے کہ

الا ان فی الجسد مضغة ان صلحت صلح الجسد کله و ان فسدت فسد الجسد کله الا وهی القلب کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ایسا ہے کہ اگر وہ درست رہے تو پورا جسم درست رہتا ہے، اور اگر وہ خراب ہو جائے اور بگڑ جائے، یا فاسد ہو جائے تو پورا جسم خراب اور فاسد ہو جاتا ہے۔ بلا شبہ طبی اور طبعی مفہوم میں بھی یہ بات درست ہے۔ لیکن یہاں ارشاد گرامی کا مقصد کسی طبی یا طَبعی مفہوم میں یہ بات کہنا نہیں ہے، بلکہ ارشاد گرامی کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی فلاح و بہبود کی اصل بنیاد اس کے قلب کی گہرائیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ تبدیلی اچھی ہو یا بُری وہ سب سے پہلے انسان کے قلب کی گہرائیوں میں جنم لیتی ہے اور جو چیز قلب کی گہرائیوں میں جنم لیتی ہے وہ انسان کو اور انسان کے حوالی اور ماحول کو متاثر کرتی ہے۔

اس مضمون کو قرآن مجید میں ایک اور آیت میں انتہائی بلیغ انداز میں اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اس کا سادہ سا مفہوم یہ ہے کہ جب تک انسان کے نفس کی گہرائیوں میں کوئی خرابی پیدا نہ ہو تو آفاق اور ماحول میں خرابی پیدا نہیں ہوتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کے عدل کے خلاف ہے کہ انسانوں کے کسی نقص کے بغیر، انسانوں کی کسی کوتاہی کے بغیر، وہ ان کے نظام اور ان کے ماحول میں فساد پیدا ہو جانے کی اجازت دے۔ دراصل انسان خود اپنے ماحول میں خرابی پیدا کرتا ہے اور خرابی کا آغاز سب سے پہلے اس کے اندر دل کی گہرائیوں میں ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کے جو چار بڑے فرائض بتائے گئے ہیں، ان میں سب سے پہلا فریضہ قرآن مجید کی آیات لوگوں تک پہنچانا اور پڑھ پڑھ کر ان کو بتانا ہے۔ اس اہم فریضہ کے بعد آپؐ کی ایک بڑی ذمہ داری **یزکیهم** بھی ہے یعنی آیات قرآنی انسانوں تک پہچانے کے ساتھ ساتھ یہ پیغمبر انسانوں کا تزکیہ بھی کرتے ہیں اور اندر سے انسانوں کی روحانی اصلاح بھی فرماتے ہیں۔ روحانی اصلاح کا یہ کام محض کسی ظاہری یا سرسری تربیت سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ یہ ایک ہمہ گیر کاوش کا ایک حصہ ہے۔ وہ ہمہ گیر کاوش جس میں انسانوں کے ذہن اور فکر کی اصلاح بھی ہو، جس کے نتیجہ میں ان کا باطن ان کے ظاہر سے ہم آہنگ ہو جائے۔ ظاہر میں باطن کی جھلک پیدا ہو، اور ظاہر کی خوبیاں اس کے باطن میں منعکس ہوتی

ہوں۔ اگر انسان کے ظاہر اور باطن میں تعارض ہے تو یا ظاہر غلط رخ پر گامزن ہے یا باطن غلط راہ پر چل رہا ہے، یا دونوں غلط کار ہیں۔

یہ بات کہ انسان کو روحانی بلندی اور قلبی پاکیزگی کیسے حاصل ہو یہ تمام بڑے بڑے مذاہب کی ترجیحی دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔ تمام بڑے بڑے مذاہب کی سرگرمیوں میں ایک بڑا میدان انسانوں کی باطنی اور اندرونی اصلاح بھی رہا ہے۔ اس موضوع پر مذاہب عالم کے بڑے بڑے مفکرین نے ہزاروں برس غور کیا ہے کہ انسان کی روحانی تربیت کس طرح کی جائے، اور اندر سے اس کی اصلاح کیسے کی جائے۔ مسیحیت، بدھ مت اور ہندو مت، یہ تین بڑے بڑے مذاہب اس کوشش میں بہت نمایاں ہیں۔ ان تینوں مذاہب کے ہاں mysticism یعنی باطنیت یا داخلیت کی روایت اتنی طویل اور اتنی گہری ہے کہ اس نے وقت کے ساتھ ساتھ ایک پیچیدہ فلسفہ کی شکل اختیار کر لی۔ ایک متبادل اور متوازی نظام کے طور بالآخر یہ فلسفیانہ روایت خود مذہب کے بالمقابل آ گئی۔ اس فلسفیانہ روایت نے روحانیت کے نام پر تفلسف کو فروغ دیا، روحانیات کی ترقی کے نام پر حقائق سے فرار کی راہ اپنائی، مذہب کی روح پر عملدرآمد کے بہانہ مذہبی احکام سے بچنے کا راستہ فراہم کیا۔

یہاں اس فلسفہ کے حسن و قبح کی تفصیل میں جانا مقصود نہیں۔ لیکن اس طویل روایت کے وجود سے یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ انسانوں کی باطنی اصلاح اور روحانی کردار سازی صرف اسلام کا نہیں بلکہ اسلام سے پہلے بھی مختلف مذاہب میں بہت اہمیت کا حامل مضمون سمجھا گیا۔

قرآن مجید نے جا بجا ان کاوشوں پر تبصرہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ کاوشیں کیوں ناکام ہوئیں۔ ان کاوشوں میں ناکامی کے اسباب و عناصر کیا تھے اور جن اسباب و عوامل سے یہ کاوشیں ناکام ہوئیں ان اسباب و عوامل سے مسلمان کیسے بچ سکتے ہیں۔ یہودیوں کے بارے میں قرآن مجید میں بتایا گیا کہ ان کا زور ظواہر پر زیادہ رہا ہے۔ ظواہر پر زور کی وجہ سے باطنی اصلاح اور حقائق امور ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ یہ افراط و تفریط کی ایک مثال ہے۔ مسیحیت میں اس کے ردعمل کے طور پر ظواہر سے صراحتاً اظہار براءت کیا گیا۔ روز اوّل سے ہی ظواہر کو منسوخ کر دیا گیا۔ سینٹ پال نے تورات کے قانون ہی کو سرے سے منسوخ کر دینے سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ اور یوں ظواہر شریعت سے قطع تعلق کا فیصلہ پہلے ہی دن کر لیا۔ پھر

روحانیت کے نام پر مسیحیت میں ایک تفلسف آ گیا۔ جب ظواہر اعمال سے تعلق ختم ہو گیا تو شریعت کے ظاہری مظاہر ایک ایک کر کے ختم کر دیے گیے۔ قانون شریعت کو پہلے دن منسوخ کر دیا گیا، محض نری روحانیت جس کی کوئی ٹھوس عقلی اور مضبوط علمی بنیاد نہ ہو انسانوں کے لیے کوئی قابل ذکر رہنمائی نہیں فراہم کر سکتی تھی۔ اس لیے لامحالہ اس کو ایک فلسفہ بننا پڑا اور اس تفلسف کا نام مسیحیت کی دنیا میں روحانیت یا mysticism قرار پایا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دین کا یہ روحانی پہلو زندگی اور خود دین کے دوسرے تمام پہلوؤں سے دور ہوتا چلا گیا۔ آخر کار دونوں میں کسی قسم کی ہم آہنگی باقی نہ رہی۔ اس پوری صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ دین کے ظاہری اور داخلی پہلوؤں کے درمیان جو تکمیلیت یا تکامل کی کیفیت ہونی چاہیے تھی، ایک دوسرے کی تکمیل کرنے کا جو رجحان ہونا چاہیے تھا، وہ پہلے دن سے ختم ہو گیا۔

قرآن مجید نے روحانی پاکیزگی اور قلب کی صفائی کا جو درس دیا ہے، جس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت احادیث نبوی ﷺ میں کی گئی ہے، اس میں پہلے دن سے اس بات کا اہتمام موجود ہے کہ ظاہری احکام اور شریعت کے باطنی مقاصد کے درمیان ایک توازن اور تکمیلیت کا رنگ برقرار رہے۔ جتنی تبدیلی ظاہر میں آئے وہ ایک حقیقی قلبی تبدیلی کی غماز اور ترجمان ہو۔ جتنی تبدیلی اندرون قلب اور روحانیات میں آتی جائے اس کا اظہار انسان کے طرزعمل میں انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہوتا چلا جائے۔ یہ بات اسلام کا ایک طرہ امتیاز قرار دی جا سکتی ہے، اور بہت سے دیگر امتیازات میں سے ایک امتیاز یہ بھی اسلام کو حاصل ہے کہ اسلام کی تعلیم میں قانون کی پابندی اور ظواہر شریعت سے وابستگی کو روحانی بلندی کا ذریعہ قرار دیا گیا اور روحانی بلندی کے عمل کو شریعت کے احکام سے وابستگی سے مشروط کر دیا گیا۔ اسلامی تاریخ میں جو شخص جتنا اونچا ولی تھا، جو شخص روحانیت کے جتنے اونچے درجے پر فائز تھا، وہ احکام شریعت کا اتنا ہی متبع اور ظواہر شریعت کا اتنا ہی پابند تھا۔ لہٰذا التزام شریعت اور تکمیل روحانیت یہ دونوں ایک ہی تعلیم کے دو پہلو ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی کتاب ہدایت کے دو باب ہیں۔ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں، دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں روحانی اور غیر روحانی سرگرمیوں میں وہ تفریق زیادہ نمایاں نہیں ہوئی جو دوسرے بہت سے مذاہب میں پائی جاتی ہے۔ اسلام کی رو سے بہت سے ایسے

معاملات جو دوسری جگہ خالص دنیاوی معاملات مانے جاتے ہیں، وہ اسلام میں روحانی رنگ اختیار کر لیتے ہیں، اگر وہ شریعت کی تعلیم کے مطابق خالص دینی جذبہ سے انجام دیے جائیں۔ اسی طرح ایسے خالص روحانی اعمال جو دوسرے مذاہب میں صرف روحانیت کے مظہر سمجھے جاتے ہیں، وہ اسلام میں انتہائی ناپسندیدہ ہو سکتے ہیں، روح مذہب سے دور قرار پا سکتے ہیں اگر وہ شریعت کے مقاصد سے ہٹ کر کیے جائیں۔ اس لیے اسلام کی تعلیم میں mundane یا profane اور religious یا spiritual کی تقسیم زیادہ معنویت نہیں رکھتی۔ یہ دونوں ایک ہی ہدایت نامہ کے دو پہلو ہیں اور دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ تکمیلیت کا یہ رنگ واضح طور پر قرآن پاک کی ان آیات میں سامنے آتا ہے جن میں رسول ﷺ کے فرائض بیان کیے گیے ہیں۔ **یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَةَ** یعنی کتاب کے ساتھ ساتھ حکمت اور دانائی کی تعلیم، حکمت اور دانائی کے مقاصد اور بنیادوں کا کتاب اللہ اور حکمت سے رشتہ جوڑنا یہ پیغمبر کی تعلیم کا اور فرائض نبوت کا ایک بنیادی حصہ ہے۔

احادیث مبارکہ سے بھی اس تکمیلیت کے بہت سے گوشے سامنے آتے ہیں۔ جو حدیث اسلام کی ساری روحانیت کی بنیاد ہے، جس سے تزکیہ و احسان کے تمام دفتر شروع ہوتے ہیں، یہ وہ حدیث ہے جس کو حدیث احسان بھی کہا جاتا ہے اور حدیث جبریل بھی کہا جاتا ہے۔ یہ حدیث صحیح بخاری، صحیح مسلم اور حدیث کی کئی کتابوں میں بیان ہوئی ہے۔ اور جید صحابہ کرامؓ نے اس کو روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی محفل میں تشریف فرما تھے۔ چاروں طرف صحابہ کرام بیٹھے ہوئے تھے، یہ سیدنا عمر فاروقؓ کی روایت ہے، صحیح بخاری کے الفاظ ہیں: **اِذ طلع علینا رجل شدید بیاض الثیاب شدید سواد الشعر** ایک شخص اچانک نمودار ہوا، جس کے کپڑے انتہائی سفید اور بال انتہائی سیاہ تھے۔ **و لا یعرفه منا احد** ہم میں سے کوئی اسے جانتا نہیں تھا۔ اس بات کی خاص اہمیت یوں ہے کہ اگر وہ مدینے کا کوئی باشندہ ہوتا تو ہم سب اسے جانتے ہوتے۔ مسافر ہوتا اور باہر سے سفر کر کے آیا ہوتا تو **شدید بیاض الثیاب، شدید سواد الشعر** نہ ہوتا۔ لباس، چہرہ اور بال گرد آلود ہوتے۔ علامات سفر اس کے جسم اور لباس سے ظاہر ہوتیں۔ ظاہر ہے کہ جو مسافر اونٹ یا گھوڑے پر سوار ہو کر ریگستان میں ایک مہینہ سفر کر

کے آئے گا اس کا لباس بھی میلا کچیلا اور گرد آلود ہوگا۔ چہرہ بھی گرد آلود ہوگا، اور اس کے بال بھی گرد آلود ہوں گے۔ شہر کا ہوتا تو ہم اسے جانتے ہوتے۔ ہم اسے جانتے بھی نہیں تھے اور سفر کر کے آیا ہوا بھی معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ **حتیٰ جلس الی النبی** ﷺ یہاں تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ **واسند رکبتیه الی رکبتیه** حضور ﷺ کے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر بیٹھا۔ اس میں سے ہر چیز قابل تعجب تھی۔ اس لیے کہ صحابہؓ اس طرح نہیں بیٹھتے تھے۔ احترام سے بیٹھتے تھے اور ذرا فاصلہ رکھ کر بیٹھتے تھے۔ پھر کہا کہ میں کچھ سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ جوابات دیں۔ **اخبرنی عن الاسلام** (اسلام کیا ہے؟ اس کے بارہ میں مجھے بتایے) حضور ﷺ نے بتایا کہ اسلام کے یہ اعمال اور یہ ارکان ہیں۔ پوچھنے والے نے کہا **صدقت**۔ آپ صحیح کہتے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں: **فعجبنا له یسئله ویصدقه**۔ ہمیں اس پر تعجب ہوا کہ سوال بھی کر رہا ہے اور تصدیق بھی کرتا ہے۔ اگر سوالوں کے جوابات معلوم تھے، تو پوچھے کیوں، اور اگر جوابات معلوم نہیں تھے تو تصدیق کیوں اور کس بنیاد پر کی۔ سوال جواب کے اس سلسلہ میں اجنبی نے اہم سوال تین پوچھے۔ ایک پوچھا کہ اسلام کیا ہے؟ جس کے جواب میں حضور ﷺ نے اسلام کے اعمال اور ارکان کا ذکر فرمایا، پانچ ارکان، یعنی کلمہ شہادت اور چاروں عبادات کا ذکر فرمایا۔ یعنی ظاہری احکام کو بیان فرمایا۔ ایمان کے بارہ میں سوال کیا تو آپؐ نے عقائد بیان فرمائے۔ پھر پوچھا **وما الاحسان**؟ احسان کیا ہے؟ جو تین حصے شریعت کے میں نے پہلے روز کی گفتگو میں عرض کیے تھے وہ تینوں اس حدیث میں موجود ہیں۔

جب احسان کا سوال کیا تو اسے جواب ملا۔ **الاحسان ان تعبد الله کانک تراه فان لم تکن تراه فانه یراک** یعنی احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، اس لیے کہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔ یہ یقین اور حضوری کا یہ کامل شعور پیدا کرنا ہی تزکیہ و احسان کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ اس شعور کو پیدا کرنے کے لیے طویل تربیت درکار ہے، پھر اس کو برقرار رکھنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔

یہ احساس جب مکمل طور پر بیدار ہو جائے اور انسان ہر وقت اور ہر لمحہ اپنے دل کی

گہرائیوں سے یہ محسوس کرتا رہے کہ میں مسلسل اللہ کی نظروں میں ہوں، اللہ تعالیٰ کی چشم بینا مسلسل مجھے دیکھ رہی ہے تو اس سے یقین وایمان کی کیفیت ہی اور ہو جاتی ہے۔ اس شعور اور یقین کے ساتھ جب عبادت انجام دی جائے گی تو اس کی کیفیت ہی کچھ اور ہوگی۔ اس کیفیت کو احسان کہتے ہیں۔ اس کیفیت کا اصل اور معیاری درجہ تو یہ ہے کہ انسان چشم عقیدت سے، چشم ایمان سے اور چشم بصیرت سے اللہ کو دیکھ رہا ہو۔ حقائق خداوندی کا ادراک کر رہا ہو۔ لیکن اگر ادراک کی سطح وہ نہ ہو تو کم از کم یقین کی اتنی سطح ہونی چاہیے کہ انسان یہ محسوس کرے کہ میں مسلسل اللہ کی نظروں میں ہوں۔ یہ احساس اسی وقت ہو سکتا ہے جب دلوں کی صفائی اور روحانی پاکیزگی ایک خاص سطح پر پہنچ گئی ہو۔ نفوس کا تزکیہ اتنا ہو چکا ہو کہ انسان کے دل میں غلط خیالات اور احساسات پیدا نہ ہوں۔ یہ بات کہ ظاہر میں تو نماز ادا ہو رہی ہے اور ذہن میں بنک بیلنس کا حساب ہو رہا ہے، یا بظاہر تو قیام اور قعود کے ارکان ہیں، اور در حقیقت ملازمت کی مراعات اور شرائط کا تعین ہو رہا ہے۔ یہ رویہ اس احساس حضوری کے خلاف ہے۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے معاملات ہو سکتے ہیں جہاں خالص عبادت میں دنیاوی آلائشیں شامل ہو جاتی ہوں۔

جب کسی انسان کے اخلاق کی اصلاح ہو چکی ہو اور اس کی اخلاقی تربیت کی سطح مطلوبہ معیار تک پہنچ چکی ہو تو اس کے اثرات لامحالہ انسان کے رویہ اور طرز عمل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ دوسرے انسانوں سے روابط کے معاملے میں اور خالق کائنات کے ساتھ اپنے تعلق بارے میں انسان کا رویہ تبدیل ہونے لگتا ہے۔ جب یہ تینوں تقاضے پُورے ہو جاتے ہیں۔ یعنی صفاء قلبی بھی، تزکیۂ نفوس بھی اور پاکیزگی اخلاق بھی تو ان سب کے مجموعی نتیجے کے طور پر وہ کیفیت سامنے آجاتی ہے جس کو حدیث میں احسان کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں آپؐ کے صحابہ کرامؓ آپ کی تربیت سے اس مقصد کو حاصل کر لیا کرتے تھے۔ صحابہ کرامؓ کے بارہ میں یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ ان میں سب کا روحانی درجہ اور مقام و مرتبہ ایک ہی تھا، یا تربیت کے اعتبار سے، یا تزکیہ کے اعتبار سے سب صحابہ ایک ہی درجہ پر فائز تھے۔ اس سے کوئی بھی اختلاف نہیں کر سکتا کہ صحابہ کرام میں جو درجہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حاصل تھا وہ دوسروں کا نہیں تھا۔ یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ جو درجہ

بقیہ خلفائے ثلاثہ کا تھا یا عشرہ مبشرہ کا تھا وہ بہت سے دوسرے صحابہ کرامؓ کا نہیں تھا۔ پھر صحابہ کرامؓ میں کچھ اصحاب وہ بھی تھے جن کو براہ راست رسول اللہ ﷺ کی تربیت میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی صرف زیارت کی اور صرف مختصر ملاقات میں آپ کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا، اور اس کے بعد اپنے اپنے علاقوں کو واپس چلے گئے اور تربیت کے لیے ان کو دوسرے صحابہ کرامؓ کے زیرِ راہنمائی کام کرنا پڑا۔ اس لیے تربیت کے مدارج میں اور اس صفاء قلبی کے مراتب میں جس طرح کا فرق حضرات صحابہ کرام کے مابین پایا جاتا تھا وہ آئندہ بھی اہل ایمان کے درمیان موجود رہے گا اور ہمیشہ رہے گا۔

یہ بات کہ ہر شخص کو ہر وقت مزید بہتر سے بہتر درجات و مراتب کے حصول کے لیے کوشش کرنی چاہیے اسلامی روحانیات کی تاریخ میں ایک امتیازی ہدف کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ بات صحابہؓ کے زمانے میں بھی عام تھی۔ صحابہ کرامؓ وقتاً فوقتاً اس ضرورت کا احساس کیا کرتے تھے کہ ایمان میں مزید شدت اور یقین میں مزید پختگی کے حصول کے لیے کچھ اضافی اقدامات کی ضرورت ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب تک حیات تھے صحابہ کرامؓ اس مقصد کے حصول کے لیے آپؐ کی مجلس میں جایا کرتے تھے اور روحانی تربیت اور مقامات کی مزید بلندیوں پر فائز ہو کر آیا کرتے تھے۔ یہ مشہور واقعہ ہم سے ہر ایک نے پڑھا اور سُنا ہے کہ ایک مشہور صحابی حضرت حنظلہؓ ایک مرتبہ گھر سے پریشانی کے عالم میں نکلے، راستے میں دیکھا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ تشریف لے جا رہے ہیں۔ حضرت صدیقؓ نے ان کے چہرہ پر پریشانی کے آثار دیکھ کر پوچھا کہ حنظلہؓ کہاں جا رہے ہو، جواب دیا کہ مجھے تو لگتا ہے کہ میں منافق ہو گیا ہوں، پوچھا کیا بات ہے۔ بتایا کہ جب حضور ﷺ کی محفل میں ہوتا ہوں تو رنگ اور ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے اور میں اس کو دیکھ رہا ہوں۔ لیکن جب گھر واپس جاتا ہوں، دوکان، کاروبار، تجارت، اور گھر بار کی مصروفیت میں رہتا ہوں تو اس وقت یہ کیفیت نہیں رہتی۔ گویا دونوں کیفیات میں یہ فرق ان کو نفاق کا ایک شعبہ محسوس ہوا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا کہ یہ کیفیت تو مجھے بھی محسوس ہوتی ہے۔ اگر یہ نفاق ہے تو بڑی بُری بات ہے۔ چلو چل کر حضور ﷺ سے پوچھتے ہیں۔ دونوں حضرات نے آ کر بارگاہ رسالت میں مسئلہ بیان کیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تسلی دی اور فرمایا کہ یہ کوئی نفاق نہیں ہے بلکہ یہ ایک فطری

امر ہے۔ اس واقعہ سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ روحانی درجات میں کمی بیشی کے احساسات صحابہ کرامؓ کو بھی پیش آیا کرتے تھے اور روحانی مراتب میں مزید بہتری کی ضرورت حضرات صحابہ کے حلقوں میں بھی وقتاً فوقتاً محسوس کی جاتی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد صحابہ کرامؓ ایک دوسرے کی مجلس سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ یہ مثالیں کتب حدیث میں ملتی ہیں کہ ایک صحابی نے دوسرے صحابی سے فرمایا: اجلس بنا نؤمن ساعة یعنی آؤ تھوڑی دیر ایک ساتھ بیٹھو، تاکہ اس طرح ساتھ بیٹھ کر ہم اپنے ایمان کو تازہ کرسکیں، یہ بات صحابہ کرامؓ ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے۔ اس لیے جب تک صحابہ کرامؓ زندہ رہے اس وقت تک ان کا خاص طور پر کبار صحابہ کرامؓ کا وجود ایک پارس پتھر تھا، جو ان میں سے کسی کے جتنا قریب آیا وہ اتنا ہی چمک گیا، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جہاں کبار صحابہ دنیا سے رخصت ہوتے گئے وہاں بڑے پیمانہ پر دنیاوی سہولتوں اور مادی آسائشوں کو بھی فروغ ہوا۔ دنیاوی اسباب اور جاہ و جلال میں بھی اضافہ ہوا۔ مال و دولت کی کثرت کی وجہ سے ایسے حالات بھی پیدا ہوئے جن میں انسان سے بعض اوقات اعلیٰ و ارفع روحانی مدارج اور اخلاقی پاکیزگی کے بلند مقاصد سے بہ تقاضائے بشری صرف نظر ہوسکتا ہے۔ ان حالات میں ایک مکمل اور جامع نظام تربیت کی ضرورت پیش آئی۔ مکمل اور جامع نظام تربیت کے لیے پہلے مرحلہ کے طور پر ان تمام ہدایات اور راہنمائی کو مدون کیا جانا ضروری تھا جو رسول اللہ ﷺ کے ذریعے، صحابہ کرامؓ کے ذریعے اور اکابر تابعین کے ذریعے سامنے آئی تھی۔ فن تفسیر مرتب ہوا، علم حدیث مرتب ہوا، فقہ مرتب ہوئی، کلام مرتب ہوا، تو تزکیے اور تربیت کا نظام مرتب ہونے میں کیا چیز مانع تھی۔ چنانچہ اکابر محدثین نے زہد، رقاق، ترغیب وترہیب اور روزمرہ کے اوراد واذکار کے موضوعات سے متعلق احادیث کے مجموعے تیار کیے۔ یہ علم تصوف کی تدوین کی طرف پہلا قدم تھا۔ جلد ہی تزکیہ اور تربیت کے آداب بھی مرتب ہوئے۔

جب کوئی چیز فنی طور پر مرتب ہوتی ہے، جب کسی علم کے حقائق کو علمی اعتبار سے مرتب کیا جاتا ہے تو اس علم کے حقائق وتصورات کو دوسرے علوم کے حقائق وتصورات سے ممیز کرنے کے لیے اصطلاحات خود بخود سامنے آجاتی ہیں۔ اصطلاحات علم تفسیر میں بھی سامنے آئیں۔ علم تفسیر کی اصطلاحات صحابہؓ کے زمانے میں نہ تھیں۔ علم حدیث کی بہت سی اصطلاحات صحابہؓ اور

تابعین کے زمانے میں نہیں تھیں۔ یہی حال فقہ اور علم کلام کی اصطلاحات کا ہے یہ سب اصطلاحات بعد میں وجود میں آئی ہیں۔ تصور پہلے سامنے آتا ہے، حقیقت پہلے وجود میں آتی ہے اصطلاحات بعد میں بنتی ہیں۔ اس لیے تمام علوم وفنون کی اصطلاحات کو نظر انداز کر کے صرف تصوف یا تربیت کی اصطلاح کے بارے میں یہ کہنا کہ چونکہ فلاں اصطلاح حضور ﷺ کے زمانے میں نہیں تھی لہذا وہ تصور جس کی وہ اصطلاح نشان دہی کرتی ہے وہ تصور بھی غیر اسلامی ہے، درست نہیں ہے۔ اگر کسی اصطلاح کا نیا ہونا کسی تصور کے ناقابل قبول ہونے کے لیے کافی دلیل ہے تو اس کی زد اسلامی علوم وفنون میں ہر علم پر پڑے گی۔

دوسری بات جو بہت سے حضرات کو غلط فہمی میں ڈالتی ہے وہ بعض متصوفین کے ایسے بیانات ہیں جو اسلامی نقطہ نظر سے قابل قبول نہیں ہیں۔ تزکیہ اور تصوف کے وسیع ذخائر میں ایسے بیانات بھی ملتے ہیں جو شریعت کی تعلیم، روایات یا روح سے متعارض ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ علم تزکیہ یا علم احسان کا ایسے بیانات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان میں سے بیشتر بیانات کی نسبت بھی مختلف بزرگوں کی طرف مشکوک ہے۔ ایسے کمزور بیانات مفسرین کے ہاں بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ بہت سے مفسرین نے اسرائیلی روایات تفسیروں میں نقل کر دی ہیں جو قابل قبول نہیں ہیں۔ علم حدیث کی تاریخ، وضع حدیث کے فتنہ اور وضاعین کی دسیسہ کاریوں سے مانوس ہے۔ تاریخ حدیث کا ہر طالب علم فتنہ وضع حدیث کی تفصیلات سے کسی نہ کسی حد تک واقف ہے۔ فقہائے کرام اور علمائے اصول اگرچہ بڑی حد تک اس سے بچے رہے، لیکن ان میں بھی بعض حضرات نے چند ایسے مباحث اور مسائل اٹھائے جن کا براہ راست تعلق فقہ، اصول فقہ اور شریعت سے نہیں تھا۔ یہی حال فلاسفہ کا ہے، فلاسفہ کے نام سے جہاں بہت سے صحیح الخیال اور متوازن قسم کے لوگ سامنے آئے وہاں بعض غلط قسم کے لوگ، زندیق اور مِلحدین بھی سامنے آئے۔

اس لیے رطب ویابس کے اس مجموعہ میں کسی چیز کو سمجھنے کا یا جاننے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کو اس کی اصل بنیادوں کی روشنی میں اور مستند ترین اور جید ترین شارحین کی تحریروں کی روشنی میں سمجھا جائے۔ جن حضرات نے تزکیہ اور احسان کے میدان میں شریعت کے احکام اور تعلیم کو مکمل طور ملحوظ رکھا اور تمام متعلقہ تصورات اور اصطلاحات کی وہ تعبیریں اور تفسیریں کیں جو

شریعت کے مقاصد کی تکمیل کرتی ہوں اور شریعت کی تعلیم کے لحاظ سے قابل قبول ہوں، تصوّف کو سمجھنے کے لیے ایسے ہی مستند اہل علم کے کلام اور پیغام سے استفادہ کیا جانا چاہیے۔ تزکیہ اور روحانیات کے باب میں جو کچھ جید اہل علم وتقویٰ نے کہا ہے اسی کو اسلامی نقطہ نظر کا مستند ترجمان اور قابل قبول نمائندہ قرار دیا جانا چاہیے۔ امام غزالی، شیخ شہاب الدین سہروردی، عوارف المعارف کے مصنف، علامہ ابن قیم، مجدد الف ثانی، علامہ عبدالوہاب شعرانی، حضرت علی ہجویری جیسے بزرگ ہی تصوف کے اصل نمائندہ اور ترجمان ہیں۔ یہاں شہاب الدین سہروردی کے نام سے غلط فہمی نہ پیدا ہونی چاہیے۔ اس نام کے دو افراد ہیں۔ ایک فلسفی تھے جن کے بارے میں ان ہی کے زمانہ کے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ان کے خیالات خلاف اسلام ہیں اور ان کی تحریروں میں اسلام سے انحراف کیا گیا ہے۔ اس زمانے کی حکومت نے انہیں الحاد اور زندقہ کے جرم میں سزائے موت دے دی تھی۔ یہ شہاب الدین سہروردی مقتول جو فلسفہ اشراق کے بانی تھے یہ ان شہاب الدین سہروردیؒ سے مختلف ہیں جو مشہور سلسلہ تصوف کے بانی تھے۔ جن سے حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کا تعلق تھا جو ہمارے برصغیر کے اکابر صوفیاء میں سے تھے۔ حضرت شیخ علی ہجویری وہ ہیں جن کی کتاب **کشف المحجوب** بہت مشہور ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے مکتوبات پوری تاریخ تصوف میں بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ برصغیر کے شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولیؒ اللہ محدث دہلوی کا درجہ بھی روحانیت اور تزکیہ واحسان کے میدان میں بہت اونچا ہے۔ یہ اور ان جیسے دوسرے حضرات وہ ہیں جنھوں نے قران وسنت کی اصل تعلیم کو سامنے رکھتے ہوئے روحانی تزکیہ اور اخلاقی تربیت کے اصول بیان کیے ہیں۔ ان حضرات نے تصوف کی اصطلاحات کی جو تعبیریں اور تشریحیں کی ہیں وہ قرآن وسنت کی رو سے قابل قبول ہیں، ان تشریحات کی بنیاد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے طرز تربیت پر ہے۔

بعض پر جوش ظاہر بینوں کا یہ استدلال اور اس پر اصرار کہ تصوف کا لفظ چونکہ صدر اسلام کی تاریخ میں رائج نہیں تھا لہذا التصوف کے نام سے جو کچھ موجود ہے وہ سارا کا سارا ناقابل اعتبار ہے، یہ کوئی علمی استدلال نہیں ہے۔ یہ اصطلاح اگر صحابہؓ کے زمانے میں نہیں تھی تو تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں وجود میں آ چکی تھی۔ زاہد پشمینہ پوش کے لیے صوفی کی

اصطلاح تابعین کے آخری زمانے کے فوراً بعد رائج ہوگئی تھی۔ تابعین کا آخری زمانہ اور تبع تابعین کا زمانہ وہ ہے جب اللہ تعالیٰ نے بہت وسیع پیمانہ پر مسلمانوں کو دنیوی مال و دولت سے نوازا۔ بنی امیہ، بنی عباس کی بڑی بڑی عظیم الشان حکومتیں قائم ہوئیں۔ اور دنیاوی وسائل اور مادی اسباب کے اعتبار سے مسلمانوں پر طرح طرح کی نعمتوں کے دروازے کھل گئے۔ ہر قسم کی دولت کی فراوانی سے ایک طبقہ میں مادیت کا سیلاب آتا محسوس ہوا۔ اس مادیت کے سیلاب میں کچھ حضرات نے یہ محسوس کیا کہ اگر استغناء اور زہد کی تعلیم کو عام نہ کیا گیا، تو آگے چل کر لوگ بھول جائیں گے کہ شریعت میں زہد و استغناء کی تعلیم بھی تھی۔ شریعت میں توبہ اور انابت کی تعلیم بھی تھی، صحابہ کرامؓ میں بعض انتہائی مستغنی اور زاہد مزاج حضرات بھی تھے۔ اس لیے امت کی بعض سعید روحوں نے زہد و استغناء، توبہ اور انابت اور ذکر الٰہی کا سبق از سر نو یاد دلایا۔ انہوں نے زہد و استغناء کے اصولوں پر نہ صرف زبانی زور دیا، بلکہ اپنے طرز عمل سے بھی انتہائی سادگی کا ایک ایسا رویہ اختیار فرمایا جس کی حدود بعض ظاہر بینوں کو ترک دنیا سے ملتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اس سادگی کے رویے کو اختیار کرنے والے ہر طرح کے حضرات تھے۔ ان میں بعض جید ترین اہل علم بھی شامل تھے، اور ایسے حضرات بھی شامل تھے جنہوں نے اپنے آپ کو صرف اخلاقی اور روحانی تربیت تک محدود رکھا۔ چونکہ یہ لوگ بہت سادہ کھانا کھاتے، موٹا جھوٹا کپڑا پہنتے، اس لیے یہ لوگ سادگی میں نمایاں ہوتے چلے گئے۔ سادہ اور موٹے کپڑے کی وہ قسم جو ان دنوں رائج تھی اس کو صوف کہا جاتا تھا۔ اس لیے بہت جلد صوف پہننے کے لیے تصوف کی اصطلاح بھی رائج ہوگئی۔ یعنی وہ شخص جو بتکلف اور بالارادہ صوف کا کپڑا استعمال کرتا ہے اور سادگی کو ایک طرز زندگی کے طور پر اپناتا ہے۔

لیکن تصوف کی اصطلاح کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہی وہ واحد اصطلاح تھی جو اس دور میں یا بعد کے ادوار میں استعمال ہوئی۔ اس کے لیے فقہ النفس کی اصطلاح بھی بعض اکابر اسلام نے استعمال کی ہے۔ الفقہ الاکبر میں حضرت امام ابوحنیفہؒ نے جہاں کلام کے مسائل سے بحث کی ہے وہاں روحانیات اور تزکیے کے مسائل کا بھی ذکر کیا ہے۔ فقہ القلب کی اصطلاح بھی بعض بزرگوں نے استعمال کی ہے۔ فقہ النفس اور فقہ الباطن کی اصطلاحات بھی استعمال ہوئی ہیں اور جیسا کہ کہا گیا ہے کہ **لا مشاحة فی الاصطلاح** کہ اصطلاح میں کوئی اختلاف نہیں

ہونا چاہیے۔ اصل اہمیت عنوان کو نہیں مندرجات کو حاصل ہوتی ہے۔

تصوف کے مندرجات کیا ہیں؟ اگر وہ شریعت کے مطابق ہیں، اگر وہ شریعت کے مقصد کو پورا کر رہے ہیں، اگر ان کی وجہ سے شریعت کے احکام پر عمل کرنے کا ذوق وشوق پیدا ہوتا ہے، تو وہ بلا شک وشبہ شریعت میں مطلوب ہیں۔ عنوان فقہ النفس ہو یا فقہ باطن ہو، یا فقہ القلب ہو، یہ وہ چیز ہے جو شریعت میں مقصود اور مطلوب ہے۔ شریعت نے قلب کی اصلاح کے لیے جو تعلیم دی ہے۔ اس کی علمی ترتیب ہی کا نام تصوف ہے۔

قرآن پاک میں اور حدیث میں ایک اہم مضمون بیان ہوا ہے اور مختلف انداز سے بیان ہوا ہے۔ شریعت نے بار بار یہ رغبت دلائی ہے کہ انسان اپنے آپ کو اللہ کے قریب کرے۔ اللہ سے ملاقات کے لیے اپنے کو تیار کرے۔ اس قربت کو قرآن مجید نے مختلف مواقع پہ مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ہم شہ رگ سے بھی زیادہ انسانوں کے قریب ہیں۔ یہ قربت جس کی قرآن مجید نے تعلیم دی ہے اس سے مراد یقیناً کوئی ظاہری یا مادی یا جسمانی قربت نہیں ہے۔ یہ ایک ایسے احساس اور شعور کا نام ہے یہ ایک ایسا شعور قربت ہے جس کو آپ روحانی قربت کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی قربت کا سب سے اونچا درجہ جب حاصل کرتا ہے جو وہ حالت سجدہ میں ہو۔ قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ یہاں جس قرب کا ذکر ہے وہ بلا ریب روحانی اور شعوری قرب ہے۔

قرب کے ساتھ ساتھ قرآن پاک نے لقاء یا اللہ سے ملاقات کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔ مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا جو شخص یہ خواہش اور آرزو رکھتا ہو کہ اللہ سے عزت وآبرو کے ساتھ ملاقات کرے تو پھر وہ عمل صالح بھی کرے۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے: وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلاً ہر طرف منہ موڑ کر صرف اللہ کی طرف رخ کر لو، ہر کسی سے توڑ کر اللہ سے جوڑو۔ یہ اور اس طرح کی بے شمار آیات کسی جسمانی یا مادی مفہوم میں اللہ کے قرب کو بیان نہیں کرتیں۔ یہ ایک ایسے قرب کو بیان کر رہی ہیں جس کو ہم خالص روحانی یا شعوری قرب قرار دے سکتے ہیں۔

حدیث پاک میں ارشاد ہوا ہے: من احب لقاء الله احب الله لقائه جو اللہ سے

ملاقات کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملاقات کو پسند کرتا ہے۔ یہ لقاء یا ملاقات کیا ہے؟ ظاہر ہے صحابہ کرامؓ نے، تابعین نے اور تبع تابعین نے اس لقاء اور قرب کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اس کوشش کی تفصیلات کو جاننا اور اس سے استفادہ کرنا بعد والوں کے لیے ناگزیر ہے۔ انہی تفصیلات کو جاننے، ان کو علمی انداز میں مرتب کرنے اور ان کی روشنی میں تربیت کے قواعد اور اصول مرتب کرنے ہی کو تصوف کو اصطلاح سے یاد کیا گیا۔ قرآن مجید نے اس قرب کے حصول کے لیے انسانوں کو اللہ کی طرف دوڑنے کی بھی تعلیم دی ہے۔ **وسارعوا دوڑو فَفِرُّوْ اِلَی اللّٰہ** ''دوڑ کر اللہ کی طرف جاؤ''۔

اگر اس دوڑ سے کوئی جسمانی دوڑ مراد نہیں ہے، اور یقیناً مراد نہیں ہے، تو یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے کہ انسان اللہ کی طرف کیسے دوڑے؟ میں اگر اللہ کی طرف دوڑ کر جانا چاہوں تو مجھے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ کہاں سے دوڑوں اور دوڑ کر کہاں جاؤں۔ ظاہر ہے میں یہاں جس جگہ کھڑا ہوں، یہاں سے دوڑ کر جاؤں تو کہاں جا سکتا ہوں، اللہ تعالیٰ کسی متعین جگہ پر physical مفہوم میں تو موجود نہیں ہے کہ میں دوڑ کر وہاں چلا جاؤں اور بالفرض اگر اس کا جسمانی وجود کسی محدود جگہ میں مان بھی لیا جائے (جیسا کہ بعض ظاہر پرست اور سادہ لوح حضرات کا اصرار رہا ہے) تو میں دوڑ کر وہاں نہیں جا سکتا۔ لہذا یہاں دوڑنے سے مُراد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مادیات کی الائش سے بچ کر دوڑو، دنیا اور مال و جاہ کی محبت میں انغماس اور انہماک سے دوڑو، حیوانی جذبات اور خواہشات سے دوڑو۔ شہوانی جذبات اور بہیمیت سے دوڑ کر الگ ہو جاؤ، اور ایک ایسے رستے پر چل پڑو جہاں سے اللہ کا قرب حاصل ہو۔ اس کا یہی مفہوم ہے اس کے علاوہ اس جگہ اور کوئی مفہوم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جب انسان دوڑنے کی اس راہ پر چل پڑتا ہے اور قرب الٰہی کا اعلیٰ اور برتر مرتبہ یا مرحلہ اس کا مقصود بن جاتا ہے تو پھر آخر کار ایک مرحلہ ایسا آنا چاہیے کہ اس کو قرب الٰہی کی مطلوبہ منزل حاصل ہو جائے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جسے بعض صوفیاء کی زبان میں وصول کے لفظ سے یاد کیا گیا۔ یعنی اللہ تک وہ پہنچ گیا، اللہ کا قرب اسے حاصل ہو گیا اور جو منزل مقصود تھی وہ اس کو حاصل ہو گئی۔

قرآن پاک نے ایک آیت میں دو انتہائی بلیغ الفاظ استعمال کیے ہیں جن سے اصحاب تزکیہ اور اصحاب احسان نے دو بڑے اسالیب مستنبط کیے ہیں۔ ایک آیت مبارکہ ہے جس

میں ارشاد ہوا ہے کہ اَللّٰهُ يَجْتَبِيٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ جس کو اللہ چاہتا ہے چن کر اپنا خاص کر لیتا ہے اور جو اس کی طرف واپس لوٹنا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو راستہ بتا دیتا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں بعض اکابر تربیت نے لکھا ہے کہ وصول اور لقاء کے باب میں انسانوں کی دو قسمیں ہیں: کچھ حضرات تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو کسی راستے کو قطع کرنے یا بہت زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اللہ تعالیٰ خود ان کو چن لیتا ہے اور رحمت خداوندی اور فضل الٰہی سے اچانک یا بہت جلد ان کو قرب الٰہی حاصل ہو جاتا ہے۔ ان کے برعکس کچھ حضرات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو اس راستہ میں بہت محنت کرنی پڑتی ہے اور طویل تربیت سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی مشیت پر مبنی ہے کہ کسی کو محنت کے بغیر منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے اور کچھ کو تربیت کی کٹھن منزل سر کرنی پڑتی ہے۔ ان دونوں راستوں میں سے ایک کو اصطلاح میں ''سلوک'' سے یاد کیا گیا، دوسرے کو اصطلاح میں ''جذب'' سے یاد کیا گیا۔ لہٰذا یہ دو راستے خود قرآن مجید سے ثابت ہیں، ان دونوں راستوں یا اسالیب کے لیے اصطلاح جو بھی استعمال کی جائے وہ غیر اہم اور ثانوی بات ہے۔ جذب اور سلوک کی اصطلاح اگر کسی کو پسند نہ ہو تو کوئی اور اصطلاح اختیار کی جا سکتی ہے۔ اجتباء کا راستہ ہو سکتا ہے اور انابت کا راستہ ہو سکتا ہے۔ ان الفاظ سے ہٹ کر کوئی اور نئی اصطلاح بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔

ان دو راستوں کی وضاحت میں بعض اکابر صوفیاء نے لکھا ہے کہ ایک طریقہ اخیار اور صالحین یعنی اچھے اور نیک انسانوں کا ہوتا ہے۔ جو کثرت عبادت، تلاوت قرآن، اور حج و زکواۃ اور راہ خدا میں جہاد کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس راستے سے انسانوں کو قربت عطا فرما دیتا ہے۔ دوسرا طریقہ وہ ہے جو اصحاب مجاہدہ کا طریقہ کہلاتا ہے۔ یہ عموماً ایسے لوگوں کے لیے موزوں ہوتا ہے جن کے اخلاق ذمیمہ بہت پختہ ہوں، اور ان کے اثرات اتنے گہرے ہوں کہ ان کو دور کرنے کے لیے بہت سی اضافی کاوشوں اور طویل کوششوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اخلاق ذمیمہ کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے اضافی محنت درکار ہوتی ہے۔ اخلاق ذمیمہ جب بہت گہرے ہو جائیں تو محض عبادت سے زائل نہیں ہوتے۔ اس کے لیے تربیت کے مدارج سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ طریق اصحاب مجاہدہ کہلاتا ہے۔ تیسرا طریق اہل شوق ہے جس

میں کسی وجہ سے انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا غیر معمولی ذوق وشوق پیدا ہو جاتا ہے اور اس ذوق وشوق کے نتیجے میں اس کو وصول حاصل ہو جاتا ہے۔ مثال میں اویسؒ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اویسؒ قرنی کے بارے میں روایت میں آتا ہے کہ یمن میں ایک بزرگ تھے جن کو رسول ﷺ سے ملاقات کا بہت اشتیاق تھا۔ کسی وجہ سے وہ مدینہ منورہ حاضر نہیں ہو سکے۔ لیکن ان کے اشتیاق اور جذبے کی حضور علیہ السلام کو اطلاع ہوئی تو حضور علیہ السلام نے صحابہ کرامؓ کو ان کے بارے میں بتایا۔ صحابہ کرامؓ میں سے بعض لوگوں نے بعد میں ان سے ملاقات کی۔ یہ اور اس طرح کے راستے ہیں۔ جن کے لیے مختلف اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔

یہ جو ذوق وشوق کی بات ہے یہ بھی محض کوئی شاعرانہ اسلوب نہیں ہے، بلکہ یہ ان احادیث سے ماخوذ ہے جن میں ایمانی ذوق وشوق کے لیے حلاوت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ثلاث من کن فیه وجد حلاوة الایمان یعنی تین قسم کے اوصاف وہ ہیں جو انسان کے اندر موجود ہوں تو اس کو ایمان کی حلاوت محسوس ہونے لگتی ہے۔ ظاہر ہے کہ لغت کی رو سے حلاوت اور مٹھاس ایک خالصۃً حسی چیز ہے۔ ایمان کی حلاوت اور مٹھاس اس طرح کی نہیں ہوتی جس طرح گلاب جامن کی حلاوت اور مٹھاس ہوتی ہے۔ لہٰذا یہاں حلاوت سے مراد ایک ایسا لطیف اور محبوب داخلی تجربہ ہے جس کو حدیث میں حلاوت کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے۔ اس سے ایک اور بات پتا چلی جس سے تصوف کے مضامین کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ وہ یہ کہ بعض لطیف روحانی اور داخلی تجربات کو بیان کرنے کے لیے انسان بعض اوقات اپنے ظاہری اور مادی تجربات میں استعمال ہونے والی اصطلاحات اور اسالیب بیان کو ہی استعمال کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ہر زبان میں ایسی بہت سی اصطلاحات ہوتی ہیں جو انسان کے داخلی تجربے کو بیان کرتی ہیں۔ لیکن وہ اصطلاحات اس داخلی تجربے کے لیے مجازاً ہی استعمال ہوتی ہیں۔ حقیقت میں وہ کسی ظاہری تجربے کے لیے وضع کی گئی ہوتی ہیں۔ یہی حلاوت کا لفظ دیکھیے! حلاوت کیا چیز ہے؟ حلاوت دراصل مٹھاس کو کہتے ہیں۔ میٹھی چیز کھانے سے لذّت کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو لغت میں حلاوت کہتے ہیں۔ لیکن یہاں ایمان کے لیے حلاوت کا لفظ استعمال کیا گیا۔ صحیح مسلم اور صحیح بخاری دونوں میں یہ روایت آئی ہے۔

ابھی میں نے عرض کیا تھا کہ بخاری اور مسلم دونوں کی مشہور روایت ہے جس میں دل کی

صلاح اور دل کے فساد کو پوری زندگی کی صلاح اور پوری زندگی کے فساد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اصلاح قلب کے لیے جہاں تعلیم و تربیت درکار ہے، جہاں ذہنی اصلاح اور اخلاقی تربیت درکار ہے، وہاں بعض اوقات کچھ نفسیاتی تدابیر کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔ اس طرح کی نفسیاتی تدابیر صحابہ کرام نے بھی استعمال فرمائی ہیں۔ سنت میں بھی اس کے اشارے ملتے ہیں اور صحابہ کرامؓ اور تابعین کے بعد آنے والے اہل تربیت نے بھی ان تدابیر سے کام لیا ہے۔ ان نفسیاتی تدابیر کا مقصد صرف یہ ہے کہ راہ حق پر چلنے والے مسافر کو شہوات سے بچنے کی مشق کرائی جائے، رذائل اخلاق کو اس کے نفس اور دل سے نکالا جائے اور مکارم اخلاق سے اس کے نفس اور دل کو متصف کیا جائے۔ حضوری کا درجہ ان تینوں کاوشوں کی کامیاب تکمیل سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

حضوری کے احساس کی یہ مشق انسان کو اس بات کی مزید ذہنی و نفسیاتی استطاعت فراہم کرتی ہے کہ شہوات سے کیسے بچا جا سکتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری کے احساس کو کیسے پختہ اور بیدار رکھا جا سکتا ہے۔ جب تک ایمان کی پختگی اور آخرت کی جواب دہی کے احساس کے ساتھ ساتھ یہ شعور حضوری تازہ و بیدار نہیں رہے گا اس وقت تک خوف خدا پیدا نہیں ہوگا۔ ہوا و ہوس قابو میں نہیں آئیں گے وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۔ یہ کیفیت جہاں عقل و ذہن اور فکر و دانش کی اصلاح چاہتی ہے وہاں قلبی اصلاح کی متقاضی بھی ہے۔ پھر ایمان جہاں ایک عقلی پہلو رکھتا ہے۔ کہ میرا ذہن اور میری عقل اس پر مطمئن ہو جائیں کہ یہ حقائق مجھے ماننے ہیں۔ وہاں اس کا ایک بہت اہم پہلو قلبی بھی ہے۔ قلبی اعتبار سے مجھے اس عقیدہ پر سکون اور اطمینان بھی حاصل ہونا چاہیے۔ اس قلبی ایمان میں شدت بھی پیدا ہوتی رہتی ہے اور مزید قوت بھی حاصل ہوتی رہتی ہے۔

ایمان قلبی کے لیے ذاتِ الٰہی سے محبت ضروری ہے۔ ذات الٰہی سے محبت کا تقاضا ذاتِ رسالت مآبؐ سے محبت ہے اور ذاتِ رسالت مآبؐ سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مکمل اطاعت کی جائے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ (اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو پھر میری اتباع کرو۔) رسول اللہ ﷺ اور ذات باری تعالیٰ سے یہ تعلق جب قائم ہوتا ہے اور یہ محبت جب پیدا ہوتی ہے تو اس کا آئیڈیل اور معیار یہ ہے کہ مکمل توازن کے ساتھ

پیدا ہو۔ اگر توازن برقرار نہیں رہ سکا تو اس کی وجہ یا تو تربیت کی کمی ہے، یا انسان کے مزاج کی کمزوری ہے۔ ہر شخص کا مزاج اتنا مکمل اور متوازن نہیں ہوتا کہ وہ اس توازن کو برقرار رکھ سکے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کی جو تربیت فرمائی وہی تربیت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اسی تربیت کا نتیجہ اور مظہر صحابہ کرامؓ کی یہ شان تھی کہ **رھبان بالیل فرسان بالنھار** کہ دن میں وہ شہ سوار ہوتے تھے، میدان جنگ میں تلوار کے جوہر دکھاتے تھے اور رات کے وقت عبادت گزار راہب کی طرح ہوتے تھے۔

سیدنا علیؓ بن ابی طالب کے بارے میں کسی شاعر نے لکھا ہے، وہ دن کے وقت ان سے ملنے گیا تو دیکھا کہ وہ عام سرکاری حکام کی طرح فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ ایک فرمانروا کے انداز میں اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ اس کو سوائے ان کی سادگی اور تواضع کے کوئی بات غیر معمولی محسوس نہیں ہوئی۔ اتفاق سے اس کو رات کے وقت اس مسجد میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں سیدنا علیؓ ابن ابی طالب عبادت فرمایا کرتے تھے۔ وہاں اس کو ایک بالکل ہی دوسرا منظر نظر آیا۔ اس کو اس نے ایک شعر میں بیان کیا ہے۔ جس میں ہے کہ دن کو وہ بادشاہوں کی طرح ہوتے ہیں۔ **وبالليل بكاء** اور رات کو آہ و بکا کی کیفیت ہوتی ہے۔ ذکر الٰہی ان کی زبان سے جاری ہوتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان بیک وقت اس کیفیت کا نمونہ بن جاتا ہے جس کے بارے میں علامہ نے فرمایا کہ **باھمه شوبے همه رو**، بیک وقت سب کے ساتھ چلو اور بیک وقت سب سے الگ تھلگ رہو۔ ایک طرف اللہ کی عبادت انجام دی جا رہی ہو، ایک طرف انسان اللہ کے حضور تبتل اور انقطاع کا رویہ رکھتا ہو۔ لذت اور مال و جاہ کے باب میں استغناء اور زہد کا رویہ رکھتا ہو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوسری طرف وہ ان تمام فرائض کا بھی پابند ہو جو ظاہری زندگی میں اس سے متعلق ہیں، وہ شرعی فرائض ہوں، یا معاشرتی ذمہ داریاں ہوں، ملی فرائض ہوں۔ یا اس کی دوسری منصبی ذمہ داریاں ہوں، وہ ان سب میں بھرپور حصہ لیتا ہو۔ تصوف زندگی میں بھرپور حصہ لینے کا نام ہے، زندگی سے فرار کا نام نہیں ہے۔ مجاہدین صوفیاء بھی ہوئے ہیں۔ مبلغین صوفیاء بھی ہوئے ہیں اور مربین صوفیاء بھی ہوئے ہیں۔ مجاہدین اسلام کی تاریخیں مرتب کی جائیں تو جتنے صف اول کے مجاہدین جناب ابوبکر صدیق اور جناب

علی ابن ابی طالب کے زمانے سے لے کر آج تک پیدا ہوئے ہیں ان میں بہت سے نام ایسے ہیں جو بیک وقت جہاد، شہادت، تصوف اور روحانیت کے میدان میں بھی بہت اونچے نام ہیں۔ مبلغین صوفیاء سے تو برصغیر کے مسلمان اچھی طرح واقف ہیں۔ ہمارے ہاں برصغیر میں اسلام جن شخصیتوں کی وجہ سے آیا وہ عموماً یہی صوفیاء کرام تھے، جنہوں نے تصوف کے ساتھ ساتھ تبلیغ کا فریضہ بھی سرانجام دیا۔ ان کے ساتھ مربی صوفیاء بھی ہر دور میں رہے ہیں۔ جنہوں نے بڑی تعداد میں انسانوں کی اصلاح کی ہے۔ یہ اکثر وہ صوفیاء جو بڑے بڑے سلاسل تصوف کے بانی بھی ہیں۔

کچھ لوگ اس پر شدومد سے اعتراض کرتے ہیں کہ تصوف کے یہ سلسلے صحابہؓ کے زمانے میں نہیں تھے اور پھر تابعین کے زمانے میں بھی نہیں تھے، لہٰذا یہ بدعت ہوئے، لیکن یہ دلیل کمزوری سے خالی نہیں۔ اس لیے کہ دور صحابہ و تابعین کے بعد اگر کسی سلسلے یا کسی مکتب فکر کا وجود بدعت ہے تو پھر مکاتب فقہ، فقہ حنفی، فقہ شافعی، فقہ مالکی، فقہ سلفی، فقہ حنبلی وغیرہ کا وجود بھی بدعت ہونا چاہیے۔ پھر کلامی مسالک اشعری، ماتریدی، حنبلی، سلفی کا وجود بھی بدعت ہونا چاہیے۔ پھر سلفیت اور ظاہریت بھی بدعت ہونی چاہیے۔

ظاہر ہے کہ ان مکاتب فکر اور مکاتب فقہ کے وجود کو بدعت نہیں کہا جا سکتا۔ ان میں سے ہر اصطلاح کا ماخذ اور منشاء صحابہ کرامؓ کی زندگی اور ان کا طرز عمل ہے۔ جب ایک شخص تربیت کرنے کے لیے بیٹھے گا، وہ صحابہؓ کے دور کی تربیت ہو یا تابعین کی اور تبع تابعین کی، یا بعد کے دور کی، تو ہر بڑے مربی کا اسلوب تربیت جدا ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر بڑے مربی کا ایک خاص اسلوب تربیت ہوتا ہے جو دوسرے بڑے مربی کے اسلوب تربیت سے مختلف ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہر بڑے استاد اسلوب کا تعلیم دوسرے استاد کے اسلوب تعلیم سے مختلف ہوتا ہے۔ جس طرح ہر بڑے فقیہ کا اسلوب فقہ و اجتہاد دوسرے فقیہ کے اسلوب فقہ و اجتہاد سے مختلف ہوتا ہے۔ جب کوئی فقیہ یا مجتہد اپنا اسلوب اجتہاد اپنے تلامذہ کو منتقل کرے گا اور وہ تلامذہ اس اسلوب کو لے کر چلیں گے تو جلد یا بدیر اس سے ایک مدرسۂ فکر وجود میں آ جائے گا، ایک school of thought سامنے آ جائے گا۔

اسی طرح ہر میدان میں مدارس فکر پیدا ہوئے ہیں۔ اسی طرح کے مدارسِ فکر تصوف میں

بھی پیدا ہوئے۔ کچھ حضرات وہ تھے کہ جنہوں نے خاص انداز کی تربیت پر زور دیا۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے علاقہ اور زمانہ کے حالات میں فلاں انداز تربیت ناگزیر ہے۔ اس سے تو علمی طور پر اختلاف کیا جا سکتا ہے کہ تربیت کا فلاں پہلو ناگزیر تھا یا نہیں تھا۔ مثلاً ممکن ہے کسی صاحب علم کی رائے میں کوئی مخصوص اسلوب تربیت ناگزیر ہو، کسی دوسرے صاحب علم کے خیال میں وہ اسلوب تربیت ناگزیر نہ ہو۔ یہ بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے فلاں اسلوب جو فلاں دور میں مثلاً بغداد میں اختیار کیا گیا وہ آج اسلام آباد میں ناگزیر نہیں ہے۔ یا غیر ضروری یا غیر مفید ہے یا counter productive، ہے لہذا آج اسلام آباد کے ماحول میں اس کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ دعوی کرنا اور اس پر اصرار کرنا کہ مثلاً ساتویں صدی ہجری میں فلاں بزرگ نے اگر قاہرہ، دمشق یا بغداد میں کسی خاص اسلوب تربیت کو اپنایا تھا ان کو یہ اسلوب وضع کرنے اور اپنانے کا اختیار نہیں تھا، یہ میرے خیال میں درست نہیں ہے۔ ہر بڑے مربی کو حدود شریعت کے اندر رہتے ہوئے اپنا خاص اسلوب وضع کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ جیسے ہر استاد کو اپنا اسلوب تدریس اختیار کرنے کی آزادی ہے۔ یہ اسلوبِ تربیت بھی اسی طرح کی چیز ہے۔ اس طرح اسلوب تربیت کے اختلاف اور تنوع سے ہوتے ہوتے یہ مختلف سلسلے وجود میں آ گئے۔

یہ روحانی پاکیزگی اتنی بڑی دولت ہے کہ جس کو روحانی پاکیزگی کسی خاص استاد سے وابستگی کی وجہ سے حاصل ہوئی اس کے لیے وہ دو جہاں کی نعمت اور دولت ہے۔ اس دولت سے وابستگی اور اس نام سے وابستگی اس کے لیے بہت فخر کی بات سمجھی گئی۔ اس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سلسلے نہ صرف مضبوط ہوتے گئے بلکہ ان کے احترام و تقدس میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔

انسانی نفس کے مدارج اور کیفیات سے بھی تصوف میں بحث ہوئی ہے۔ اس لیے کہ اخلاقی تربیت اور روحانی تزکیہ نفس انسانی کی اصلاح کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ خود قران مجید سے پتا چلتا ہے کہ نفس انسانی کے درجات مختلف ہیں۔ ایک درجہ نفس کا وہ ہے جو برائی کا حکم دینے والا نفس ہے، وہ نفس امارہ کہلاتا ہے۔ ایک نفس وہ ہے کہ وہ تربیت کے نتیجے میں برائی کا حکم دینا بند کر دیتا ہے، یا کم از کم پہلے سے کم کر دیتا ہے، لیکن نفس سے غلطی پھر بھی ہوتی رہتی ہے۔ انسان

سے جب غلطی ہوتی ہے تو اس کا نفس غلطی پر متنبہ کرتا ہے اور مسلسل انسان کو اس کی غلطیوں سے آگاہ کرتا ہے، یہ نفس لوامہ ہے۔ جو یقیناً نفس امارہ سے اونچا، بلکہ بہت اونچا، درجہ ہے۔ اس کے بعد جب اس مسلسل ملامت کے نتیجے میں انسان اپنی اصلاح کرتا جاتا ہے تو بالآخر قرآن کی حقانیت اور تعلیم نبوت کی صداقت پر مطمئن ہو جاتا ہے، تو اس کو نفس مطمئنہ کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ پھر نفس راضیہ اور مرضیہ کا ذکر بھی قرآن میں موجود ہے۔

ان اصطلاحات سے کم از کم اتنی بات تو پتا چلتی ہے کہ قرآن مجید نفس کے مدارج اور اس کے مراحل کو تسلیم کرتا ہے اور ان کو جا بجا بیان کرتا ہے۔ ان مدارج کے حصول کے لیے، ایک درجے سے دوسرے تک، دوسرے سے تیسرے تک، چوتھے اور چوتھے سے پانچویں درجہ میں جانے کے لیے تربیت اور عمل درکار ہے۔ اسی تربیت اور عمل کے لیے قرآن پاک نے جو ہدایات دی ہیں یہ وہ ہیں جن کو اعمال قلبیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

شریعت کے کچھ اعمال تو وہ ہیں جو اعمال ظاہری کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں، یہ اعضاء و جوارح کے اعمال ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ بہت سے اعمال ایسے ہیں جو اعمال قلبیہ کہلاتے ہیں۔ جس شریعت نے نماز کا حکم دیا ہے، جس شریعت نے زکواۃ کی ادائیگی کا حکم دیا ہے۔ اسی شریعت نے توبہ کا حکم بھی دیا ہے۔ اسی شریعت نے زہد اور توکل کی تعلیم بھی دی ہے۔ جس شریعت نے حدود اور تعزیرات کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے، اسی شریعت نے قناعت اور صبر و شکر کی تعلیم بھی دی ہے۔ اسی نے رضا بالقضا کی تعلیم بھی دی ہے۔ یہ سب قلبی احکام ہیں اور دراصل ان کیفیات سے عبارت ہیں جو انسانوں کو حاصل ہونی چاہیں۔ ان کیفیات کا تعلق انسان کے قلب سے ہے۔ اگر انسان کا دل ان کیفیات کا مرکز بن جائے اور اس کو وہ اخلاقی مراتب اور روحانی مدارج حاصل ہو جائیں جو شریعت کا مقصود و مطلوب ہیں تو وہ بتدریج نفس امارہ سے نفس لوامہ اور نفس لوامہ سے نفس مطمئنہ وغیرہ کی طرف آسانی سے سفر کر سکتا ہے۔

سفر کی یہ اصطلاح شریعت نے عام طور پر استعمال کی ہے۔ خود شریعت کے بارے میں عمومی گفتگو کرتے ہوئے میں پہلے دن کی گذارشات میں عرض کیا تھا کہ شریعت کے معنی بھی راستہ کے ہیں۔ صراط مستقیم کے معنی بھی راستہ اور سیدھے راستہ کے ہیں۔ سبیل کے معنی بھی رستہ۔ سواء السبیل کے معنی بھی سیدھا راستہ۔ پھر امام کے معنی بھی راستہ ہیں۔ پھر راستے پر چلنے

کی کے لیے روشنی کی ضرورت پڑتی ہے، روشنی نہ ہو تو تاریکی میں راستہ پر نہیں چلا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اپنے آپ کو نُور کہتا ہے۔ اس لیے راستہ اور سفر کے جتنے بھی لوازم ہیں وہ اکثر و بیشتر بطور اصطلاح کے قرآن پاک اور احادیث میں استعمال ہوئے ہیں۔ اگر شریعت راستہ ہے اور ہر مسلمان اس پر چلتا ہے، تو روحانی راستے پر چلنے کے لیے اگر سفر کے ہم معنی اصطلاحات استعمال کر لی جائیں، مثلاً سیر یا سلوک کی اصطلاحات، تو وہ ہرگز قابل اعتراض نہیں ہونی چاہییں۔

جہاں قرآن مجید نے مثبت طور پر مکارم اخلاق کی تعلیم دی ہے، وہاں منفی طور پر رذائل اخلاق سے بچنے کا حکم بھی دیا ہے۔ چنانچہ حرص سے منع کیا ہے۔ حسد اور غضب سے منع کیا ہے، بخل سے منع کیا ہے۔ عجب اور کبر سے روکا ہے۔ ریا کو برا قرار دیا ہے۔ یہ تمام منہیات قلبیہ ہیں۔ جیسے ظاہری اعمال سے متعلق منہیات ونواہی ہیں اسی طرح قلبی اعمال کے بھی منہیات و نواہی ہیں۔ ایک عام انسان کے لیے ظاہری طور پہ اندازہ کرنا عام طور پر بڑا دشوار ہوتا ہے کہ میرے دل میں حسد کا جذبہ کتنا ہے یا کبر کتنا ہے۔ کبر کا اظہار یا عجب کا اظہار اگر اعمال میں ہو تو کسی حد تک اس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اعمال یا زبان سے اس کا اظہار نہ ہو تو بعض اوقات اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اور عمل سے اظہار بھی بعض اوقات ایسے لطیف انداز میں ہوتا ہے کہ بڑے بڑے ماہرین کے علاوہ کسی کو اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ کبر یا عجب ہے۔

جن حضرات نے ان موضوعات پر لکھا ہے مثلاً امام غزالیؒ نے اور حضرت مجددؒ صاحب اور دوسرے بزرگوں نے، ان کی بحثوں میں اتنے لطیف نکتے محسوس ہوتے ہیں جن تک عام اصحاب علم کی نظر نہیں جاتی۔ حضرت مجدد صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ بعض اوقات تواضع کبر کی چادر اوڑھ کر سامنے آتی ہے۔ بعض اوقات کبر تواضع کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آتا ہے۔ اندر سے کبر ہوتا ہے لیکن اس کا اظہار تواضع کے انداز سے ہوتا ہے۔ یہ انسان کی ایک ذہنی اور نفسیاتی کمزوری ہے۔ اس طرح کی خرابیاں بے شمار ہیں جن کو دور کرنے کے لیے فقہاء نفس کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور فقہ النفس ہی وہ میدان ہے جس کو تزکیہ اور احسان کی اصطلاح سے یاد کیا گیا ہے۔

قرآن مجید نے جا بجا ذکر کی تعلیم دی ہے۔ اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيرًا یعنی اللہ کو

کثرت سے یاد کرو، فَاذْكُرُونِيٓ اَذْكُرْكُمْ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کرنے سے کیا مراد ہے؟ یہاں اللہ کو یاد کرنے سے مراد کیا ہے؟ اس کے بارہ میں ہمارے زمانہ کے کچھ حضرات کو روایتی ذکر کے تصور پر شرح صدر نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ کو یاد کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی شریعت اور احکام کو یاد رکھا جائے۔ یقیناً یہ یاد بھی ذکر کے مفہوم میں شامل ہے۔ لیکن قرآن پاک کی بہت سے آیات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ محض احکام کو یاد رکھنا ذکر کے لیے کافی نہیں ہے۔ احکام کی یاد اور اہتمام ذکر کا لازمی نتیجہ اور تقاضا ہونا چاہیے۔ قرآن مجید نے اہل ایمان کے بارے میں کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو دن میں اور رات۔ لیٹے ہوں یا بیٹھے ہوں۔ سو رہے ہوں یا جاگ رہے ہوں، بستر پر ہوں، یا کھڑے ہوں، یہ اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ یہاں اللہ کو یاد کرنے سے مراد محض اس کے احکام کو یاد رکھنا نہیں، بلکہ یہاں واضح طور پر ذکر لسانی مراد ہے کہ زبان سے ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے مختلف مواقع کے لیے مختلف اذکار کی تعلیم بھی فرمائی ہے۔ احادیث کی کتابوں میں کثرت اور تواتر سے یہ ہدایات ملتی ہیں کہ صبح سو کر اٹھو تو یہ دعا پڑھو، رات کو بستر پر جاؤ تو یہ دعا پڑھو۔ فلاں سرگرمی ہو تو یہ دعا پڑھو۔ اس کا مطلب واضح طور پر یہی ہے کہ ذکر سے مراد بہت سی آیات میں صرف ذکر لسانی ہے۔ زبان سے اللہ کو یاد کرنے کے جو مختلف فارمولے احادیث میں بیان ہوئے ان پر عمل کرنا قرآن پاک کے احکام کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ ذکر کے ان احکام پر عملدر آمد کو عمل سے فرار قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ اسی عمل کی تیاری کے لیے، اسی ذمہ داری کا احساس برقرار رکھنے کے لیے یہ اذکار مسلمانوں کو سکھائے گئے ہیں۔ یہ بھی بتایا گیا کہ ذکر زبان سے بھی کرو، دل میں بھی کرو، بلند آواز سے بھی کرو، اور آہستہ آواز سے بھی کرو۔ بعض اوقات بلند آواز سے ذکر مفید ہوتا ہے۔ بعض اوقات آہستہ آواز سے ذکر مفید ہوتا ہے۔ اس کا تعلق متعلقہ افراد کی ذاتی افتادِ طبع سے ہوتا ہے اور ان کی اس موقعہ کے لحاظ سے تربیتی ضرورت سے بھی۔

صحابہ کرامؓ اپنے ذوق کے مطابق مختلف انداز سے ذکر کرتے تھے۔ دوسرے متعدد امور کے علاوہ اس معاملہ میں بھی صحابہ کرام میں مختلف ذوق کے حضرات موجود تھے۔ رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ کی رات کی عبادت کا جائزہ لینے تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ حضرت ابوبکر

صدیقؓ بہت پست آواز سے تلاوت یا ذکر فرما رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ بہت بلند آواز سے ذکر یا تلاوت کر رہے تھے۔ اگلے دن آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیق سے پوچھا کہ تم ذکر پست آواز سے کیوں کر رہے تھے؟ صدیق اکبرؓ نے فرمایا جس کو سنا رہا تھا وہ دلوں کے بھید بھی جانتا ہے۔ لہٰذا کسی بلند آواز کی ضرورت نہیں تھی۔ حضرت عمرؓ سے پوچھا تم بلند آواز میں ذکر کیوں کر رہے تھے؟ کہنے لگے کہ میں ذکر کے ساتھ ساتھ سوئے لوگوں کو جگانا چاہتا تھا، غافلوں کو متنبہ بھی کرنا چاہتا تھا اور دشمنوں کے دلوں کو جلانا بھی چاہتا تھا۔

اب آپ دیکھیں کہ یہاں اللہ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ لیکن ذکر کے پہلو بہ پہلو دوسرے مقاصد و محرکات بھی موجود ہیں۔ اس سے پتا چلا کہ ذوق مختلف انسانوں کے مختلف ہو سکتے ہیں۔ جب دو بڑے صحابہؓ کے دو مختلف ذوق ہو سکتے ہیں تو بقیہ صحابہ کرام میں بھی بہت سے ذوق ممکن ہیں۔ اب جب یہ صحابہؓ اپنے تلامذہ کی دینی اصلاح اور تربیت کریں گے تو ان کے شاگردوں کے ذوق بھی مختلف ہوں گے۔ اور جو شاگردوں کا ذوق بنے گا تو وہ پھر آگے چل کر شاگردوں کے پورے سلسلے میں نمایاں ہوگا۔ اس لیے جن حضرات نے ذکر کے اس حکم کو یا ذکر کی اس تعلیم کو تربیت کا ایک حصہ بنایا، ان میں مختلف انداز یا اسلوب ہمیں ملتے ہیں۔ خود ہمارے دور میں جنوبی ایشیا میں، برصغیر میں، برصغیر سے باہر مختلف دینی تحریکوں کے قائدین نے، دینی تربیت کرنے والے اور اصلاح امت کا کام کرنے والوں نے ذکر کو کسی نہ کسی حیثیت میں اپنی تربیت کا ایک جزو بنایا۔ اخوان المسلمین کے بانی استاذ حسن البنا شہید خود ایک تبلیغی اور روحانی سلسلے سے وابستہ تھے۔ انہوں نے دعاؤں کا ایک مجموعہ مرتب کیا۔ وہ مجموعہ ایک زمانے میں بہت مقبول تھا اور اخوان المسلمون سے وابستہ حضرات اس مجموعے کو استعمال کیا کرتے تھے۔ جب سعودیوں کی حکومت شروع شروع میں قائم ہوئی تو سلطان عبدالعزیز نے دعاؤں کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جو ایک طویل عرصے تک سعودیوں میں اور آل سعود میں مقبول رہا۔ یہ دعائیں وہ تھیں جو قرآن پاک یا حدیث میں آئی ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے ذوق کے مطابق منتخب دعاؤں کا ایک مجموعہ مرتب کیا اور ان کے ماننے والوں نے اس کو اپنایا۔

عام طور سے کہا جاتا ہے کہ صوفیاء اپنے زمانے کے احدی ہوا کرتے تھے۔ اردو میں احدی کا لفظ ایک بیکار، سست، نالائق اور کمزور آدمی کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔ صوفیا کے

بارہ میں عام طور پر تصور یہ ہے کہ جتنے صوفیاء ہوتے ہیں وہ احدی ہوتے ہیں۔ اور احدی بننے میں یا ان کو کام چوری اور عمل سے فرار میں توکل کے غلط تصور نے مزید سہولت بہم پہنچائی۔ اکابر صوفیاء کے ہاں توکل کا جو تصور ہے وہ بعینہ وہی ہے جو قرآن پاک اور حدیث میں بیان ہوا ہے۔ توکل کے لفظی معنی تو ہیں بھروسہ کا رویہ اختیار کرنا۔ لیکن اصطلاح میں توکل سے مراد یہ ہے کہ اسباب کو اختیار کرنے کے بعد اسباب کے نتیجے کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دینا۔ اور پھر جو نتیجہ سامنے آئے اس کو اللہ کی قضا سمجھ کر اس پر راضی رہنا۔ توکل کا یہ مفہوم اس مشہور حدیث پر مبنی ہے جس میں بتایا گیا ہے رسول اللہ ﷺ سے ملنے کے لیے ایک نومسلم بدو صحابی مدینہ منورہ آئے اور بہت جذبے سے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ جانور کہاں چھوڑا۔ یعنی جس اونٹ پر سوار ہو کر آئے تھے وہ کہاں ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں نے باہر چھوڑ دیا ہے۔ فرمایا کیوں؟ انہوں نے کہا اللہ پر توکل کیا ہے۔ اس لیے اس کو چھوڑ آیا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: نہیں باہر جاؤ **اعقلها و توکل** پہلے اسے باندھ دو، پھر اللہ پر توکل کرو۔ یعنی جانور کی حفاظت کا جو کم سے کم طریقہ یا سبب ہے اس کو اپناؤ۔ اس سبب کو اختیار کرنے کے بعد پھر نتیجے کو اللہ پر چھوڑ دو۔

اس سے اکابر اسلام نے یہ نتیجہ نکالا کہ کسی چیز کے لازمی اور رائج الوقت اسباب کا اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں ہے **تعاطی الاسباب لا ینافی التوکل**. لہٰذا اسباب کو اختیار کرنا چاہیے، لیکن اختیار کرنے کے بعد نتیجہ کو اللہ کی مشیت کے سپرد کر دینا چاہیے اور جو نتیجہ سامنے آئے اس کو اللہ کا فیصلہ اور قضاء سمجھ کر اس پر راضی ہو جانا چاہیے۔

اسباب کو اختیار کرنے کے تین درجے ہیں، ایک درجہ تو وہ ہے جو مطلوب ہے۔ اس کے لیے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا: **و اجملوا فی الطلب** . **اجمال فی الطلب** یعنی اسباب کو اختیار کرنے میں اور کسی مادی چیز کے حصول میں درمیانے راستے کو اختیار کرو، اجمال سے کام لو۔ اسباب ہی کو سب کچھ سمجھ کر صرف اسباب کے پیچھے مت پڑو۔ اللہ پر توکل کرو۔ یہ توکل کا سب سے عام درجہ ہے۔ دوسرا درجہ توکل کا یہ ہے جس کو بہت سے لوگ اصل توکل سمجھتے ہیں، لیکن وہ توکل کا عام درجہ نہیں ہوتا، کہ جو عام اسباب کسی دور میں رائج ہیں ان اسباب کو انسان مکمل طور پر کما حقہ استعمال نہ کرے یا کسی ایک جزوی سبب کو کافی سمجھے، اور اپنے ایمان کی

پختگی کے ساتھ اس کے نتیجے کے لیے تیار ہے۔ اس توکل کی خاص خاص لوگوں کو ان کے ایمان اور مقام رضا پر بھروسہ کرتے ہوئے بعض بزرگوں نے اجازت دی ہے اور بعض اکابر کے طرز عمل سے استدلال کیا ہے۔ دوران تربیت کسی خاص مرحلہ پر توکل کی یہ نوع اختیار کی جاسکتی ہے، لیکن یہ کوئی دائمی امر نہیں اور نہ ہر شخص اس پر عملدرآمد کا مکلّف ہے۔ ان دونوں قسموں کے برعکس توکل کے یہ معنی کہ تمام اسباب چھوڑ دیے جائیں اور کوئی سبب سرے سے اختیار نہ کیا جائے۔ اور پھر یہ امید باندھ لی جائے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خود بخود نتائج پیدا ہوں گے، یہ شریعت کی تعلیم اور مزاج کے خلاف ہے۔ ایسا توکل اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کی مشیت نہیں ہے۔

یہ اور اس طرح کی تعلیم ان اخلاقی، قلبی اور روحانی امور کے بارہ میں ہے جن کی قران مجید نے واضح طور پر اور براہِ راست ہدایات دی ہیں۔ کچھ مکارم اخلاق ہیں۔ یا اعمال قلبیہ ہیں جن کو حاصل کرنا چاہیے۔ کچھ اعمال قلبیہ ہیں جن سے انسان کو بچنا چاہیے۔

تجربے سے یہ بھی پتا چلا کہ بعض ظاہری اعمال کا اثر انسان کے داخلی اور باطنی اعمال پر بھی پڑتا ہے۔ اس لیے جب تربیت کی بات آئے گی اور کوئی شیخ یا کوئی مربی کسی شاگرد کی تربیت کرے گا تو وہ یہ بھی دیکھے گا کہ اس کے ظاہری اعمال اور طور طریقوں میں کن کن اصلاحات کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی تربیت کرنے والا تربیت کا تقاضا یہ سمجھے کہ کسی جائز کام کے کرنے پر حدود لگائی جائیں۔ تو یہ عارضی حد بندی یا پرہیز تربیت کے منافی نہیں ہیں اور اس سے احکام شریعت کی خلاف ورزی لازم نہیں آتی۔

مثال کے طور پر ایک عام مشاہدہ ہے کہ اگر انسان بہت زیادہ کھائے تو طبیعت سست ہو جاتی ہے، اور جب طبیعت سست ہو جائے تو عبادات میں وہ طمانینت اور حلاوت اور تلاوت قران میں وہ لذت محسوس نہیں ہوتی جو ہونی چاہیے۔ رات کو بہت زیادہ کھا کر سو جانے سے نماز تہجد کے لیے بیدار ہونا اور سکون سے عبادت ادا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ عبادات میں سستی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے اگر کوئی مربی اور شیخ اپنے نظام تربیت کا ایک جزو یہ بھی قرار دے کہ جب تک کسی فرد کی تربیت ہو رہی ہے اس وقت تک اس کی خوراک کو محدود کر دیا جائے، بعض خاص خاص اوقات میں کھانے کی ممانعت کر دی جائے، یا بعض چیزوں کی کھانے کی ممانعت کر دی جائے تو یہ تربیت کا ایک حصہ ہے جو بعض اوقات نفسیاتی تربیت کا ایک جزو قرار دیا جاتا

ہے۔ اسی طرح زیادہ سونا، زیادہ بولنا، زیادہ ہنسنا غفلت پیدا کرتا ہے۔ اس لیے ظاہری اعمال کے ان نتائج کی وجہ سے بعض بزرگوں نے ان چیزوں کو کم یا منضبط کرنا چاہا۔ چنانچہ بعض صوفیوں کے ہاں قلت طعام۔ قلت کلام۔ قلت منام اور قلت اختلاط مع الانام پر بہت زور دیا گیا۔ کہ کم کھاؤ، کم بولو، کم سوؤ، اور لوگوں سے کم ملو۔ یہ بھی عام تجربہ اور مشاہدہ کی بات ہے کہ زیادہ میل جول سے ذمہ داریوں اور فرائض کی انجام دہی میں غفلت پیدا ہوتی ہے۔ غیر ضروری میل جول میں اضافہ ہو جائے تو انسان بہت سے سنجیدہ معاملات پر توجہ نہیں دے پاتا۔ یہ بھی عام تجربہ اور مشاہدہ کی بات ہے۔ اس لیے تربیت کے معاملے میں جب صوفیاء کرام نے اور تربیت دینے والے بزرگوں نے ان اسالیب کی نشان دہی کرنی چاہی جن اسالیب سے مدد لے کر لوگوں کی تربیت کی جا سکے تو بہت سے اسباب انہوں نے ایسے بھی اختیار کیے جن کا براہ راست مطالبہ قرآن وسنت نے نہیں کیا تھا۔ یعنی وہ اعمال فی نفسہ شرعاً فرض یا واجب نہیں تھے، لیکن وقتی مصلحت کے تحت ناگزیر تھے۔ اس وقتی مصلحت میں ترمیم بھی ہو سکتی ہے، اضافہ بھی ہو سکتا ہے بعد میں آنے والے پہلے آنے والوں سے بھی اختلاف کر سکتے ہیں اور حالات اور زمانے کی رعایت سے ان میں تبدیلی بھی ہو سکتی ہے۔

ان تمام کاوشوں کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ عمل میں اخلاص پیدا ہو اور اللہ کے حضور جوابدہی کا احساس بیدار ہو، تاکہ حتی یکون هواه تبعاً لما جئت به پر عمل ہو سکے، اور وہ جذب اندروں پیدا ہو جس کی طرف علامہ اقبال نے کئی جگہ اشارہ کیا ہے کہ:

صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق
کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

اگر جذب اندروں نہ ہو تو پھر صفیں کج، دل پریشاں اور سجدہ بے ذوق ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایک امر واقعہ ہے

تصوف کے بارہ میں خاص طور پر اور دوسری بہت سی دینی سرگرمیوں کے بارہ میں عام طور پر ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے: انسانوں کا خاصہ یہ ہے کہ جب کوئی فکر، کوئی دعوت، کوئی مشن یا کوئی پیغام کسی خاص ماحول میں اپنی جگہ بناتا ہے تو وہاں اس کی ایک متعین اور عملی صورت جنم لیتی ہے، جس کے نتیجہ میں اس نظریہ یا دعوت کو institutionalize کیا جاتا

ہے۔ اس institutionalization کے کچھ فوائد بھی ہوتے ہیں، کچھ نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ فائدہ تو یہ ہے کہ اس پیغام کے یوں ادارہ بن جانے سے عمل میں باقاعدگی آ جاتی ہے۔ یہ باقاعدگی جب بہت مدت تک جاری رہے تو اس سے ایک طرح کی یکسانیت سی پیدا ہو جاتی ہے۔ عمل میں یکسانیت اور تسلسل پیدا ہو جاتا ہے۔ اس یکسانیت اور تسلسل کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ اس سے خوب اچھی طرح مانوس ہو جاتے ہیں۔ آگے چل کر بعد میں آنے والے یہ فرق نہیں کر پاتے کہ اس دعوت کا اصل مقصد کیا تھا اور یہ institution کس مقصد کی خاطر بنایا گیا تھا۔ ان میں سے بہت سے پرجوش مقلدین اور کم علم متبعین یہ اندازہ نہیں کرتے، یا نہیں کر سکتے، کہ دعوت میں اصل مقصد کیا تھا، مطلوب حصہ کون سا تھا، اور اس سارے کام میں وسیلہ کی حیثیت کس پہلو کو حاصل تھی۔ حکمت عملی کے تحت کون کون سی چیزیں اختیار کی گئی تھیں۔ یوں مقاصد اور وسائل میں فرق نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

یہ بات کہ وسائل اور مقاصد میں فرق نہ کیا جا سکے۔ یہ بعد میں آنے والوں میں اکثر کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور ہر دور میں ہوا ہے۔ فقہ میں بھی ہوا ہے، تصوف میں بھی ہوا ہے، کلام میں بھی ہوا ہے۔ اور تفسیر و حدیث کے باب میں بھی ہوا ہے۔ تجدید و احیاء کی تحریکات میں بھی ہوا ہے، دینی تحریکات میں بھی ہوا ہے اور دوسرے اداروں میں بھی ہوا ہے۔ مثلاً درس و تدریس کے ادارے قائم کیے گئے، مقصد کیا تھا؟ صرف دینی تربیت کی فراہمی اور دینی علوم کی نشر و اشاعت، ان مقاصد کے حصول کے لیے بعض وسائل استعمال کیے گئے، بعض صورتوں میں ان وسائل نے اصل مقاصد کی حیثیت اختیار کر لی۔ یوں وہ ثانوی امور جو دراصل وسائل تھے بعد میں آنے والے لوگوں کی نظر میں اصل مقاصد بن گئے اور یوں اس کم فہمی اور پرجوش تقلید کے نتیجے میں جو اصل مقاصد تھے وہ پس منظر میں چلے گئے۔

یہ المیہ صرف تصوف کے ساتھ نہیں ہوا، یہ سب کے ساتھ ہوا ہے۔ ایک مرحلہ آتا ہے کہ نام رہ جاتا ہے اور حقیقت گم ہو جاتی ہے۔ ہمارا دور تو ایک ہزار سال بعد کا ہے۔ شیخ علی ہجویریؒ نے ایک بزرگ کا قول نقل کیا ہے وہ اپنی کتاب کشف المحجوب میں کہتے ہیں کہ آج کل تصوف ایک نام ہے بغیر حقیقت کے۔ یعنی پانچویں صدی ہجری میں ہی انہوں نے یہ محسوس کیا کہ زمانہ سابق میں یہ ایک حقیقت تھی بغیر نام کے، گویا پہلے تزکیہ و احسان کی ایک

حقیقت تھی، بعد میں اس حقیقت کو ایک نام ملا، نام کے بعد اس کو حاصل کرنے کا ایک طریقہ کار سامنے آیا۔ اس طریقہ کار پر عملدرآمد کے لیے کچھ لوگ متعین ہو گئے۔ جب افراد متعین ہوئے تو ان کی سہولت کی خاطر بعض ادارے وجود میں آئے۔ جب ادارے وجود میں آئے تو اداروں کو چلانے کے لیے وسائل سامنے آئے۔ اب وسائل ہی لوگوں کا مقصد بن گئے اور وسائل کے علاوہ باقی چیزیں ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

یہ بات کہ نفس انسانی کو اللہ کی عبادت کے لیے تیار کیا جائے، اس تیاری میں اہل کمال کے مطلوبہ کمالات اور روحانی ترقیات کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، جن مکارم اخلاق کی شریعت نے تعلیم دی ہے وہ نہ صرف سب کو حاصل ہو جائیں بلکہ اصحاب ایمان کے رگ وپے کا حصہ بن جائیں اور جن رذائل سے بچنے کا شریعت نے حکم دیا ہے وہ دل سے کلی طور پر نکل جائیں۔ یہی وہ مقاصد ہیں، جو تصوف سے لوگوں کے پیش نظر تھے۔ اہل علم نے اپنے اپنے زمانے میں یہ تعریفات اور اصطلاحات عامۃ الناس کی تفہیم کی خاطر ان حقائق اور تعلیمات کو بیان کرنے کے لیے وضع کی تھیں جو ایک ایک کر کے نظر انداز ہوتی چلی گئیں۔ لیکن یہ بات پہلے دن سے جید ترین اہل علم کے سامنے تھی اور ہمیشہ سامنے رہی کہ تعلیم وتربیت کا یہ سارا نظام شریعت ہی کا ایک حصہ ہے۔ شریعت ہی کے مقاصد کی تکمیل کے لیے ہے اور شریعت کے بقیہ دو پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اگر کوئی اور راستہ اختیار کیا جائے گا تو وہ قابل قبول نہیں ہو گا۔

امام مالکؒ کا ایک جملہ مشہور ہے۔ امام مالکؒ کی اپنی کسی کتاب میں تو نہیں دیکھا، لیکن ان سے منقول ہے۔ جملہ بڑا زبردست ہے۔ اگر ان کا نہیں بھی ہے تو جس کا بھی ہے اس نے بہت اچھی بات کہی۔ انہوں نے کہا کہ **من تصوف و لم یتفقه فقد تزندق** جس نے تصوف کے راستے کو اختیار کیا اور فقہ کے احکام کو اختیار نہیں کیا یعنی شریعت کے دوسرے دو حصوں پر عمل نہیں کیا **فقد تزندق** اس نے گویا زندیقیت کا راستہ اپنایا۔ اس کی منزل بالآخر زندیقیت ہے اور وہ زندیق ہو کر رہے گا۔ **ومن تفقه ولم یتصوف فقد تفسق** جو شخص صرف شریعت کے ظاہری پہلوؤں پر توجہ دے گا اور اندر سے داخلی پہلو کو توجہ کا مستحق نہیں سمجھے گا وہ فاسق ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب شریعت کے احکام کی پیروی اندر سے نہ ہو، محض ظاہرداری سے کی جا رہی ہو تو انسان ظاہرداری کے لیے اور دوسروں کو دکھانے کے لیے سب

کچھ کر لیتا ہے۔ اس کے اندر روح باقی نہیں رہتی۔ **و من جمع بینهما فقد تحقق** اور جس نے ان دونوں کو بیک وقت اختیار کیا وہ حقیقت کو پا گیا۔ جنید بغدادی صوفیہ کے امام اور تیسری صدی ہجری کے صف اول کے مربی اور اہل تزکیہ میں سے ہیں۔ ان کا یہ جملہ امام غزالی شیخ علی ہجویری اور کئی حضرات نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ **کل طریقة ردتها الشریعة فهي زندقه** ہر وہ طریقہ جو شریعت میں نا قابل قبول ہو وہ زندقہ ہے۔

لہٰذا فقہ اور تصوف دونوں شریعت ہی کے دو پہلو ہیں۔ دنوں ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ اگر ایک فقہ النفس ہے، تو دوسرا فقہ العمل ہے۔ اگر ایک فقہ الجوارح ہے تو دوسرا فقہ القلب ہے۔ تصوف نہ ہو تو فقہ کی حقیقت پر عملدرآمد مشکل ہے۔ اور فقہ نہ ہو تو تصوف پر عملدرآمد مشکل ہے۔ اور فقہ نہ ہو تو تصوف پر عملدرآمد کا دعوی محض زندقہ ہے۔ اور ان دونوں کے بغیر مکمل ایمان کا مکمل ہونا بڑا دشوار ہے۔

حقیقت، اخلاص، عشق الٰہی، توبہ، انابت، جذبہ اندروں، یہ ساری چیزیں وجدانی اور ذوقی ہیں۔ ایمان کی حلاوت میرے اندر ہے یا نہیں ہے، یہ محض ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے۔ آپ اسے نہ کسی ترازو سے تول سکتے ہیں، نہ کسی ظاہری اور مادی پیمانہ سے ناپ سکتے ہیں۔ نہ کوئی ایسا مقیاس الحرارت پایا جاتا ہے جو ایمان کی حرارت کو محسوس کر کے ناپ سکے۔ یہ تو ایک صاحب ذوق انسان خود محسوس کر سکتا ہے کہ اس کے دل میں ایمان کی حلاوت ہے کہ نہیں ہے۔ اس لیے متقدمین کے ہاں ان چیزوں کو بیان کرنے کا رجحان نہیں تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ کسی روحانی کیفیت کا پایا جانا ایک خالصتاً داخلی چیز ہے اور میرے اور اللہ کے درمیان ایک راز ہے، اس کو دوسروں سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جب یہ تعلیم مدون ہونا شروع ہوئی، اس پر کتابیں لکھی جانے لگیں تو ان داخلی تجربات کی تفصیلات بھی ضبط تحریر میں آنے لگیں۔ ان تجربات کو بیان کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ حقیقی تجربہ کو وہمی اور غیر حقیقی تجربہ سے ممیّز کیا جائے، اور بساط دل کے تازہ واردان کو یہ بتایا جائے کہ ان کے واردات میں کیا چیز صحیح ہے اور کیا غلط۔ بہر حال جب ان نازک معاملات کو بیان کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کے لیے مجاز اور استعارہ کا رنگ اختیار کرنا پڑا۔ ان تجربات کو بیان کرنے میں زبان کی تنگدامانی مانع ہوئی، مجبوراً ایسے بہت سے الفاظ استعمال کیے گیے جو

دراصل مجاز اور استعارے کا رنگ رکھتے ہیں۔

ابھی حلاوت کا میں نے ذکر کیا ہے۔ متعلقہ احادیث میں حلاوت کا لفظ ایک مجازی اور استعارے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ یہی حال بقیہ اصطلاحات کا بھی ہے۔ ان سے بیشتر اصطلاحات میں تشبیہ، مجاز اور استعارے سے کام لیا گیا، اس لیے کہ تصوف کے اکثر حقائق کا تعلق داخلی تجربہ اور ذوقی امور سے ہے۔ اس لیے صوفیاء کی بہت سی اصطلاحات کی تعبیر ان کے خالص ظاہری اور لغوی مفہوم کے مطابق کرنا درست نہیں۔ جس طرح حلاوت کی لغوی تشریح نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح بقیہ اصطلاحات کی بھی نہیں ہوسکتی۔ دنیا کے باقی تمام علوم وفنون میں یہ بات بلا تأمل تسلیم کی جاتی ہے کہ اصطلاح کی تعبیر اور تشریح کا اختیار اہل اصطلاح ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ قانون دانوں کی اصطلاح کی تعبیر کریں ملٹری کے لوگ، اور ملٹری اصطلاحات کی تفسیر کریں فلسفی، اور فلسفے کی اصطلاحات کی تفسیر کریں مثال کے طور پر ماہرین تجارت۔ اگر ایسا ہونے لگے تو تمام اصطلاحات کا مفہوم غلط قرار پا جائے گا اور ان حقائق کی درست تعبیر نہیں ہوسکے گی جن حقائق کی وہ اصطلاحات نمائندہ یا ترجمان ہیں۔

اصطلاحاتِ تصوف وقت کے ساتھ ساتھ پھیلتی گئیں اور بڑھتی گئیں۔ ان اصطلاحات میں چھٹی ساتویں بلکہ آٹھویں صدی ہجری کے بعد ایک نیا رنگ پیدا ہوا۔ ابھی تک یعنی چھٹی صدی ہجری تک تصوف کا اکثر مواد ان علماءِ کرام کا مرتب کیا ہوا تھا جو علمائے کرام بیک وقت فقیہ بھی تھے۔ متکلم بھی تھے، محدث اور مفسر بھی تھے۔ چھٹی صدی ہجری کے وسط سے قبل کی کتب تصوف میں سے پیشتر کے مصنف ان میں سے اکثر میدانوں کے ماہر تھے۔ مثلاً امام ابوالقاسم قشیری، ابونصر سراج، کلاباذی، غزالیؒ یا اور دوسرے حضرات۔ ساتویں صدی ہجری کے بعد سے اس میدان میں ادباء بھی داخل ہو گئے، شعراء بھی میدان میں آ گئے۔ بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے تصوف کے مضامین کو اپنی اپنی کتابوں میں بیان کرنا شروع کیا۔ ان شاعروں اور ادیبوں میں کچھ تو علماء تھے، مثلاً مولانا رومیؒ، اور مولانا جامیؒ۔ کچھ ایسے حضرات تھے جو علماء نہیں تھے یا اس درجے کے علماء نہیں تھے۔ لیکن یہ اصطلاحات سب نے اپنائیں اور ان اصطلاحات میں مزید اضافے کیے۔ شاعروں میں بہت سے ایسے بھی تھے جو تصوّف کے مضامین سے محض شاعرانہ دلچسپی رکھتے تھے اور اصل حقائق و معارف سے ان کا ذاتی، عملی یا تجربی واسطہ نہ تھا۔

ایسے ہی ایک شاعر کا یہ قول مشہور ہے کہ: تصوّف برائے شعر گفتن خوب است۔

جس زمانے میں صوفیانہ مضامین کو نظم کرنے والے شعراء سامنے آئے یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کا سیاسی زوال اور معاشرتی انحطاط بہت نچلی حدود کو چھور ہا تھا۔ بغداد کا زوال ہو چکا تھا۔ تاتاریوں نے پوری دنیا اسلام کو برباد کر دیا تھا، بڑے بڑے جید علماء کرام شہید ہو چکے تھے اور مسلمانوں کا کوئی سیاسی مقام یا وقار دنیا میں نہیں رہا تھا اور ہر طرف مایوسی پھیل رہی تھی۔ اس مایوسی کے عالم میں بعض صوفیاء کرام نے مسلمانوں کو امید کا پیغام دینا چاہا۔ جن میں سب سے بڑا نام مولانا جلال الدین رومیؒ کا ہے۔ انہوں نے اتنے زور وشور سے رجائیت کا یہ نغمہ بلند کیا ور لوگوں کو بلند آواز اور آہنگ یہ بات یاد دلائی کہ اسلام کا مقصد کسی مادی مفاد کا حصول نہیں ہے، یا ریاست اور سلطنت کا قیام اصل مقصود نہیں ہے، یہ ایک ثانوی چیز ہے۔ اصل چیز کردار اور شخصیت کی تشکیل وتعمیر ہے۔ روحانیت کی تشکیل وتعمیر ہے۔ اس انداز کو مقبول بنانے کا سب سے بڑا سبب خود مولاناؒ کا غیر معمولی کام اور نام تھا، ان کا اخلاص اور زور بیان تھا۔ جلد ہی ان کے کلام، بالخصوص مثنوی نے پوری دنیائے اسلام کو اپنی گرفت میں لے لیا اور یہ بات جس نے بھی کہی بہت درست کہی کہ

مثنوئ مولوئ معنوی
ہست قرآن در زبان پہلوی

دنیائے اسلام کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک مثنوی مقبول ہوگئی۔ مثنوی کی مقبولیت سے متاثر ہو کر، یا کسی اور وجہ سے، یا اس زمانے کے حالات اور رنگ کو دیکھ کر، بہت سے ایسے شعراء بھی اس میدان میں آ گئے جن کا اپنا مقام ومرتبہ حقیقی روحانیات کے میدان میں محل نظر قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بعض کا مقام ومرتبہ اس میدان میں اتنا بلند نہیں تھا جتنا مولانا رومیؒ اور ان کے درجہ کے دوسرے حضرات کا تھا۔ ایسے عام شعراء نے بھی شعر وشاعری کے ذریعے کو اپنایا اور اس شعر وشاعری کے ذریعے کو اپنانے کی وجہ سے یہ الفاظ و تصورات پوری دنیائے اسلام میں مقبول ہو گئے۔ یہ دوسرے حضرات جو بعد میں سامنے آئے، ان میں حافظ شیرازی کی مثال میں نمایاں طور پر دینا چاہتا ہوں۔ ان کے شاعرانہ کمالات نے جہاں ان کے کلام کو دنیائے اسلام کے چپہ چپہ میں ترکی سے بنگال تک اور

ترکستان و تاتارستان سے دکن تک عام کیا، وہاں صوفیانہ مضامین اور صوفیانہ اصطلاحات کو بھی گھر گھر عام کر دیا۔ حافظ شیرازی واقعی صاحب حال صوفی تھے کہ نہیں تھے، یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ بعض لوگ ان کو بہت بڑا صوفی سمجھتے ہیں اور ان کے اشعار کی اسی طرح تعبیر کرتے ہیں، جس طرح اکابر صوفیہ کے کلام کی جاتی ہے۔ بعض دوسرے لوگ انہیں اسی طرح کا ایک عام شاعر سمجھتے ہیں جیسے اور شاعر ہوتے ہیں اور گل وبلبل کی شاعری کرنے سے زیادہ ان کی کوئی غرض نہیں ہوتی۔ کچھ ناقد اور اہل علم حضرات کے خیال میں حافظ کے کلام کے مثبت پہلوؤں کے مثبت اور مفید اثرات بھی ہوئے۔ علامہ اقبال ان کے اثرات کو بہت منفی قرار دیتے ہیں۔

حافظ اور حافظ جیسے بہت سے شاعروں کی وجہ سے ایسے باطنی تصورات بھی مسلمانوں میں پھیل گئے جو دراصل اکابر صوفیاء کرام کے تصورات نہیں تھے۔ یا صوفیاء کرام کے ہاں ان پر وہ زور نہیں دیا جاتا تھا یا وہ ترتیب و ترجیح نہیں تھی جو حافظ کے کلام سے سامنے آئی۔ پھر جب حافظ اور دوسرے شعراء نے صوفیانہ اصطلاحات استعمال کرنا شروع کیں تو ان کے کلام کے ذریعہ ایسی اصطلاحات بھی سامنے آنے لگیں جو خالص شہوانی مقاصد اور مادہ پرستانہ معاملات کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ چنانچہ قامت اور زلف، خط اور ابرُو اور شراب اور نشہ اور اس طرح کی ساری رموز واصطلاحات عام ہوگئیں جن کے بارے میں یہ تعین کرنا دشوار ہے کہ شاعر نے ان اصطلاحات کو کس مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ ان رموز کے بارہ میں یقین سے یہ کہنا بہت دشوار بات ہے کہ ان رموز کا مقصد واقعی روحانی اسرار ہیں یا ان کے ذریعہ دانستہ یا نادانستہ باطنیت اور اباحیت کے لیے راستہ ہموار کیا جا رہا ہے۔

یہاں تک کہ ہمارے مرزا غالب نے بھی صوفیانہ مضامین اور صوفیانہ اصطلاحات کو اپنے کلام میں کثرت سے استعمال کیا۔ بعض لوگوں نے مرزا غالب کے کلام کی شرح اس طرح لکھی ہے کہ اس میں اور امام غزالی کی **احیاء العلوم** یا مولانا روم کی مثنوی میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ لیکن مرزا غالب کا جو رویہ اور طرز زندگی تھا وہ سب کو معلوم ہے۔ تصوّف اور شریعت سے ان کے تعلق کی کیا کیفیت تھی یہ بھی کوئی مخفی بات نہیں ہے۔ چونکہ وہ ہم سے قریبی زمانے کے ہیں، اس لیے ان کے بارے میں یہ کہنے میں ہمیں کچھ تامل نہیں ہے کہ وہ کس طرح کے آدمی تھے اور ان کے مشاغل کیا تھے۔ ان کی دلچسپیاں کیا تھیں۔ سب جانتے ہیں۔ بلاشبہ مرزا غالب

عالمی اور انسانی ادب کی تاریخ کے ایک بہت بڑے شاعر تھے، یہ اپنی جگہ ایک الگ بات ہے۔ لیکن ان کے کلام کو تصوّف کا حقیقی ترجمان قرار دینا بالکل دوسری بات ہے۔ حافظ کا زمانہ چونکہ ذرا پرانا ہے، ان کی زندگی پر ایک غموض سا چھایا ہوا ہے۔ اس لیے ہم نہیں جانتے کہ ان کا طرز زندگی کیا تھا۔ مرزا غالب کی طرح کا تھا یا واقعی اہل اللہ کی طرح کا، یہ اللہ کو معلوم ہے۔ لیکن اس طرح کے شعراء کی وجہ سے بہت سی مبالغہ آمیز باتیں پھیل گئیں، اور ایسے تصورات سامنے آنے لگے جو اصل صوفیاء کرام یا ارباب تزکیہ اور تعلیم کا مقصود نہیں تھے۔

اسی زمانے میں یعنی چھٹی صدی ہجری سے لے کر بارہویں تیرھویں صدی ہجری تک صوفیاء کے تذکرے بھی بہت کثرت سے لکھے گئے۔ بہت سے اکابر صوفیہ کے ملفوظات مرتب کیے گئے۔ ان ملفوظات اور تذکروں میں بہت بڑا حصہ غیر مستند باتوں کا ہے۔ خود بعض بڑے اکابر اور اہل علم صوفیاء نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ اس پورے ذخیرہ مناقب وملفوظات میں سے کوئی چیز بھی علمی طور صحیح صوفی فکر کی نمائندگی نہیں کرتی۔ صوفیانہ تعلیمات کیا ہیں؟ ان کا مأخذ صرف قرآن پاک اور سنت ہے، یا اس فن کے مستند اور معتبر ماہرین (جن میں سے بعض کا میں نے نام لیا) ان کی علمی تحقیقات اور دینی تحریریں ہیں۔ کسی صوفی کا تذکرہ، کسی صوفی کے ملفوظات، کسی بڑے سے بڑے صوفی کی یاداشت ان تعلیمات کا مأخذ نہیں ہے۔

غلط فہمی کی ایک اور وجہ بعض اصطلاحات بھی ہیں جن میں سے ایک دو کی میں نے نشاندہی کی ہے۔ ایک اصطلاح کی میں مزید نشاندہی کرنا چاہتا ہوں، جس کو بہت غلط سمجھا گیا اور اس غلط سمجھے جانے کے بعض اسباب بھی ہیں، یہ فنا کی اصطلاح تھی۔ یہ اصطلاح بہت سے بزرگوں نے استعمال کی ہے۔ فنا کے لغوی معنی تو فناء ہو جانا، ختم ہو جانا یا annihilation کے ہیں۔ اب اگر یہ فنا کسی physical مفہوم میں ہو تو قرآن مجید نے اس کی کہیں تعلیم نہیں دی ہے۔ قرآن پاک نے کہیں بھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ انسان اپنے آپ کو جسمانی طور پر فنا کر لے۔ اس لیے فنا کی اصطلاح کے لغوی معنی یہاں بالکل مراد نہیں ہیں۔

جن حضرات نے مثلاً حضرت مجدد صاحب نے یا شاہ ولیؒ اللہ نے یا اور حضرات نے فنا کی وضاحت کی ہے۔ انہوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ فنا سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے قلب اور روح کو اس طرح سے تربیت دے کہ اس کی وہ تمام مادی اور شہوانی خواہشات فنا ہو جائیں

جو اس کی ہوا و ہوس پر مبنی ہیں اور شریعت سے متعارض ہیں۔ ان تمام خواہشات کو فنا کر دینے کا نام اور ایسی فطرت بنا لینے کا جس کے نتیجہ میں اتباع رسالت کے تقاضے بطور طبعی معاملات کے پوری ہونے لگیں، اس کیفیت کو فنا کی اصطلاح سے یاد کیا گیا۔ حتیٰ کہ ''وہابی صوفیاء'' نے بھی فناء کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ عام تصور یہ ہے کہ ہمارے وہابی بھائی تصوّف کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ جن کی فقہ کی پیروی ہمارے سعودی بھائی کرتے ہیں۔ ان کے زمانے سے لے کر کم و بیش سو سال پہلے تک اس فقہ کے متبعین میں بے شمار اہل تصوف پیدا ہوئے ہیں۔ حنبلی صوفیہ میں سب سے بڑا نام امام تصوّف شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا ہے، بلکہ سب سے بڑے صوفی اس روایت میں خود شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ ہیں۔ جن کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ علمبرداران فقہ سلف اور ارباب ظواہر میں سب سے نمایاں نام انہی کا ہے۔ ان کی دو ضخیم کتابیں جو ان کی فتاویٰ کی دسویں اور گیارہویں جلد پر مبنی ہیں اس باب میں بہت اہم ہیں۔ یہ دونوں ضخیم جلدیں تمام تر تصوف کے مضامین و مسائل پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے ایک جلد کا نام ہے **علم السلوک** اور دوسری جلد کا نام ہے: **علم التصوّف**۔ ان دنوں جلدوں میں مسائل تزکیہ و احسان کے بارہ میں علامہ ابن تیمیہ نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اور شیخ احمد سرہندیؒ کی تحریروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ صرف اصطلاحات اور انداز بیان کا فرق ہے۔ ابن تیمیہ نے عربی میں لکھا ہے۔ شیخ احمد سرہندی نے فارسی میں لکھا ہے۔ غلط تصوف پر جو تنقیدیں ابن تیمیہ کی ہیں وہی اور ویسی ہی تنقیدیں شیخ احمد سرہندیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی بھی ہیں۔ سوائے زبان، انداز بیان اور اصطلاحات کے فرق کے ان حضرات کی تحقیقات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی فنا کی اصطلاح کو نہ صرف قبول کیا ہے بلکہ اس کو پسند کیا ہے اور اس کے یہی دو مفہوم قرار دیے ہیں۔ اگر وہ کسی جسمانی فناء کی مفہوم میں ہے تو وہ نا قابل قبول ہے اور اس کی شریعت نے تعلیم نہیں دی ہے۔ لیکن اگر وہ خواہشات کو مٹا کر شریعت کے مطابق بنانے کے مفہوم میں ہے تو وہ نہ صرف قابل قبول، بلکہ وہ اسلام کا مقصود و ہدف ہے۔

آج کل دور جدید میں تصوف کا احیاء ایک نئے انداز سے ہو رہا ہے۔ لیکن اس میں دو پہلو بڑے خطرناک ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کے اس احساس کا تعلق ہے کہ یہ ایک تعمیری اور

انتہائی وقیع مثبت روایت تھی اور بیسویں صدی کی روزافزوں مادیت کے ماحول میں مسلمانوں کی توجہ اس سے ہٹ گئی اور مختلف اسباب کی بناء پر اس سے گزشتہ سوسوا سو سال کے دوران غفلت برتی گئی، اب اس روایت کا احیاء ہونا چاہیے، یہ شعور تو خود اپنی جگہ انتہائی قابل قدر ہے۔ لیکن اس روایت کو عرصہ دراز سے بعض غیر مسلم طاقتیں بھی اپنے سیاسی اور استعماری مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہ رہی ہیں اور ماضی میں بھی انہوں نے اس کو استعمال کرنا چاہا۔ 72-1971 میں سوویت یونین نے ایک باقاعدہ پالیسی کے تحت یہ فیصلہ کیا تھا کہ دنیائے اسلام میں تصوف کے نام پر ان اباحیت پسند مفکرین کی سرپرستی کی جائے جو باطنیت کے علمبردار رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ساتویں آٹھویں صدی کے بعد کے زمانہ میں باطنیت نے تصوف میں بڑا نفوذ پیدا کیا تھا، اور باطنیت کے مقاصد کی تکمیل کے لیے باطنی کارندے تصوف کے لبادوں میں سامنے آئے تھے۔ سوویت یونین کے کارندوں کا خیال تھا کہ اس باطنی انداز فکر کو زندہ کیا جائے۔ آپ میں سے بعض حضرات کو شاید یاد ہو کہ وہاں سے ایک مفکر بابا جان غفوروف ۱۹۷۳ء میں پاکستان آیا تھا اور اس نے پورے ایک مہینے پاکستان کا دورہ کیا تھا اور ہر جگہ تصوف کو زندہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ یہ ۱۹۷۳ء میں اس سوویت یونین کی طرف سے کوشش رہی ہے جو مذہب ہی کو سرے سے تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اب وہ لامذہب ملحدین اباحی اور باطنی تصوف کے علمبردار تھے۔ وہ کوشش الحمدللہ کامیاب نہیں ہوئی۔

آج کی مغربی طاقتیں بھی دنیائے اسلام میں تصوف کو زندہ کرنا چاہ رہی ہیں۔ بعض مسلم ملکوں میں تصوف کی چیئرز قائم ہو رہی ہیں۔ یہ محض اتفاق بھی ہوسکتا ہے اور پیر مغرب کے اس نسخے کے اثرات بھی ہو سکتے ہیں، جو اہل مغرب نے سوچا ہے۔ پچھلے دنوں امریکی سی آئی اے کے معاون اور ہمکار ادارہ رینڈ فاؤنڈیشن (Rand Foundation) کی طرف سے ایک رپورٹ آئی تھی، جس میں عام مسلمانوں میں اثر ورسوخ رکھنے والے گروہوں کی نشان دہی کی گئی تھی۔ جن طبقات کی سرپرستی کرنے کا مشورہ حکومتِ امریکہ کو دیا گیا تھا۔ ان میں اہل تصوف کے بعض گروہ بھی شامل تھے۔ وہ اہل تصوف جو منحرف تصوف کے نمائندہ ہوں۔ جو باطنیت سے متاثر ہوں اور شریعت اور طریقت کی اس جامعیت کی نمائندگی نہ کرتے ہوں، جس کے نمائندہ امام غزالیؒ اور شیخ احمد سرہندیؒ ہیں۔

بہر حال، یہ تھا خلاصہ تصوف کی اس تعلیم کا جس کو علماء اسلام نے ایک مرتب علم اور فن کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہ مرتب علم یا فن جس کو بعض اہل علم نے فقه النفس کے نام سے یاد کیا ہے، بعض اور حضرات نے فقہ باطن کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور تزکیہ و احسان جس کا لقب قرار پایا، یہ عرف عام میں تصوف کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ایک مکمل اور جامع نظام تربیت کا نمائندہ ہے جس میں نئے نئے مضامین اور ابواب شامل ہوئے۔ جیسے جیسے بقیہ تمام علوم میں ارتقاء ہوتا گیا اور نئے نئے مضامین اور نئے نئے ابواب تفسیر، حدیث اور کلام وغیرہ میں شامل ہوتے گئے، اسی طرح فقہ القلب میں بھی اضافہ ہوتا گیا، مباحث و مضامین میں نئے نئے موضوعات شامل ہوتے چلے گئے اور یوں یہ فن بہت ابتدائی آغاز میں اپنی سادہ نوعیت سے بڑھ کر ایک مرتب اور منظّم علم کی شکل اختیار کر گیا، جس سے ان تمام حضرات نے بحث کی ہے جنھوں نے اسلامی علوم فنون کی تاریخ پر یا علوم فنون کی تدوین اور تقسیم پر لکھا ہے۔

شیخ ابوالحسن شاذلی جو مشہور صوفیاء میں سے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ تصوف سے مراد وہ فن ہے جس کے ذریعے انسانی نفس کو عبادت کے لیے تیار کیا جائے اور احکام الٰہی کی تعمیل کے لیے اس کو آمادہ کیا جائے۔ ایک مشہور مصنف جن کی کتاب کشف الظنون اسلامی علوم وفنون کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتی ہے، یعنی حاجی خلیفہ، وہ تصوف کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تصوف سے مراد وہ علم ہے جس کے ذریعے اہل کمال کی روحانی ترقیوں کی کیفیات معلوم ہوتی ہیں اور نوع انسانی جیسے جیسے سعادت کے مدارج میں ترقی کرتی رہتی ہے، ان ترقیات کا علم اور کیفیات معلوم ہوتی ہیں۔

شیخ الاسلام زکریا انصاری کا کہنا ہے کہ تصوف سے مراد وہ علم ہے جس کے ذریعے تزکیہ نفس کی کیفیات کا علم ہو۔ اخلاق کی ستھرائی اور پاکیزگی حاصل ہو اور ظاہر و باطن کی تعمیر ہو۔ یہ سب کام اس مقصد کے لیے ہوں کہ وہ ابدی سعادت اور خوش بختی حاصل ہو جائے جو اسلام کا اور تمام آسمانی مذاہب کا مقصد حقیقی ہے۔ جیسا کہ امام شعرانی نے لکھا ہے کہ تصوف کی اصل حقیقت یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ شریعت پر عمل کرنے کا راستہ آسان ہو جائے۔ لہذا جو عالم بھی اخلاص کے ساتھ اللہ کے حضور جوابدہی کا احساس رکھتے ہوئے اپنے علم پر عمل کرتا ہے وہی درحقیقت، حقیقی معنی میں صوفی ہے۔

صوفی کی حقیقت یہی ہے کہ وہ عالم جس کا علم اور عمل دونوں برابر ہوں، نہ علم عمل سے زیادہ ہو، نہ عمل علم سے کم یا زیادہ ہو۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو شخص علم میں جتنا بڑھتا جائے گا تصوف اور مقامات تصوف میں بھی اتنا ہی بڑھتا چلا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ تصوف کی تعریف کرنے والے تمام اہل علم نے تصوف کی تعریف میں اخلاقی اور روحانی کمالات کی ترقی، نوع انسانی کی سعادت میں بہتری اور ان تمام مدارج اور کمالات کی معرفت کو بیان کیا ہے جو دراصل صوفیائے کرام کا مقصود ہوتے ہیں۔

برصغیر کے ایک صاحب علم نے تصوف کی اس طرح تعریف کی ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ سے منسوب فقہ کی تعریف کا ایک حصہ بن جائے۔ امام صاحب نے فقہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا **معرفة النفس مالها و ما عليها** یعنی انسانی نفس کی یہ معرفت کہ اس کو یہ پتہ چل جائے کہ اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں، اور اس کے حقوق کیا ہیں؟ یعنی دینی اور شرعی واجبات اور فرائض کا علم اور معرفت، یہی درحقیقت فقہ ہے۔ امام صاحب کی اس تعریف کے بارے میں اہل علم کا ہمیشہ سے یہ کہنا رہا ہے کہ اس میں علم اصول اور علم فروع یعنی علم کلام، اصول فقہ اور جزئیات فقہ سب شامل ہیں، اس لیے کہ نفس کی جو ذمہ داریاں روحانیات کے بارے میں ہیں، ان کا علم بھی فقہ کہلاتا ہے اس لیے فقہ کی تعریف جیسا کہ امام صاحب نے کی ہے انتہائی جامع تعریف ہے، فقہ کی اس تعریف میں شریعت کے وہ تمام ابواب شامل ہیں جن سے اس سلسلہ محاضرات میں گفتگو کی گئی ہے، یعنی انسان کے ظاہری اعمال سے متعلق احکام، انسان کے عقیدہ و ایمانیات اور فکر سے متعلق ہدایات اور اخلاقی اور روحانی ستھرائی اور پاکیزگی کے بارے میں شریعت کی رہنمائی۔ اگر ایسا ہے تو یقیناً فقہ، خاص طور پر فقہ النفس اور فقہ القلب، اعلی ترین علوم میں سے ہے، اس لیے کہ یہ حقائق کا اور منازل و احوال کا علم ہے، اور اس معاملے کا علم ہے جو اللہ اور بندے کے درمیان ہوتا ہے، جس کے ذریعے اطاعت میں اخلاص پیدا ہوتا ہے، اللہ کی طرف توجہ مرکوز ہوتی ہے۔

تصوف اور فقہ کے درمیان جو گہرا تعلق ہے اس کی طرف کئی بار اشارہ کیا جا چکا ہے۔ حضرت امام مالک سے منسوب وہ قول بھی جو متعدد صوفیاء نے نقل کیا ہے، ہم نے دیکھا، جس میں امام صاحب نے فرمایا تھا کہ جس شخص نے فقہ جانے بغیر تصوف پر کاربند ہونے کی کوشش

کی اس کے بارے میں خطرہ ہے کہ اس کا انجام زندیقیت پر نہ ہو۔ اسی طرح سے جو شخص تصوف کے بغیر فقہ کے ظاہری احکام پر عمل کرنا چاہے گا اس کے بارے میں قوی خطرہ اس بات کا ہے کہ وہ فسق و فجور کے راستے پر چل پڑے۔

شریعت اور تصوف یا فقہ اور تصوف کے اس گہرے تعلق کے بارے میں شاید ہی کوئی قابل ذکر شخصیت ایسی ہو جس نے اس کی وضاحت نہ کی ہو۔ تصوف کے تمام قابل احترام نمائندگان اس بات پر زور دیتے آئے ہیں، مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں ایک جگہ لکھا ہے کہ **فردائے قیامت از شریعت خواھند پرسید،** روز قیامت شریعت کے بارے میں سوال کیا جائے گا، **از تصوف نہ خواھند پرسید،** تصوف کے نکتوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔ **دخول جنت وتجنب از نار وابستہ باتیان شریعت است،** جنت میں داخلہ اور جہنم سے نجات شریعت سے وابستہ رہنے پر ہے، شریعت پر عملدرآمد کرنے پر موقوف ہے، اس لیے یہ بات کہ شریعت و تصوف یا فقہ و تصوف دونوں ایک ہیں، یہ تمام علمائے تصوف کے یہاں متفق علیہ رہی ہے، ایک فقہ النفس ہے دوسرا فقہ الاعمال ہے۔

فقہ کے بغیر تصوف بے معنی ہے۔ اس لیے کہ اگر کوئی شخص شریعت کے ظاہری احکام پر عمل نہیں کر رہا تو اس کا تصوف محض ایک جھوٹا دعویٰ ہے، اسی طرح سے تصوف کے بغیر کوئی فقیہ نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ جو عمل فقہ کے احکام پر وہ کر رہا ہے، جس کا وہ دعویدار ہے اس میں اگر اخلاص، سچائی اور توجہ نہیں ہے تو وہ بیکار ہے اور یہ سچائی اور توجہ تصوف کے ذریعے پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر سرے سے ایمان ہی نہیں ہے تو نہ فقہ ہے نہ تصوف، اس لیے کہ ایمان کے بغیر یہ دونوں ناقابل قبول ہیں۔ اس لیے کہ جیسا کہ شیخ ابو العباس زروق نے لکھا۔ ہے یہ تینوں ایک ہی چیز ہیں، اصل ایمان ہے جس کے دو رخ ہیں، ایک ظاہری رخ ہے جو سب کو نظر آتا ہے، اور ایک باطنی رخ ہے جس کا تعلق انسان کے دل، نیت، اور قلب و روح سے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تصوف کے اپنے زمانے کے سب سے بڑے امام جن کو سید الطائفہ کے لقب سے یاد کیا گیا ہے، جنید بغدادی نے لکھا ہے کہ **کل طریقة ردتها الشریعة فهی زندقة،** ہر وہ طریقہ جس کو شریعت نے رد کر دیا [redacted] ہے۔ اس لیے کہ شریعت ایک کل ہے

اور طریقت اس کا ایک جزو ہے، ایک بزرگ نے لکھا ہے کہ شریعت درخت ہے اور طریقت اس کو پانی دینے کے مترادف ہے۔ اگر شریعت ایک جسم ہے تو طریقت اس کی غذا اور دوا ہے، عام حالات میں اس کی حیثیت غذا کی ہے اور بعض خاص حالات میں وہ دوا کے قائم مقام ہو جاتی ہے۔ تصوف کی بعض تدابیر کی حیثیت دوا کی بھی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام اکابر تصوف اس پر زور دیتے آئے ہیں کہ ایک شیخ طریقت کی بنیادی شرائط میں یہ بات شامل ہے کہ وہ شریعت کے علم کی معرفت رکھتا ہو، جو شخص علوم شریعت سے کلی طور پر ناآشنا ہے وہ ایک مخلص مسلمان تو شاید ہوسکتا ہے۔ لیکن شیخ طریقت اور استاد تربیت نہیں ہوسکتا۔

شیخ طریقت اور استاد تربیت کے لیے ضروری ہے کہ وہ شریعت کے احکام پر عمل کرتا ہو۔ شیخ عبدالوہاب شعرانی نے اپنی کتاب انوار قدسیہ میں لکھا ہے کہ ایک شیخ وقت کی علامت یہ ہے کہ وہ کتاب وسنت کا گہرا علم رکھتا ہو، ان دونوں کے تمام احکام پر ظاہر اور باطن دونوں صورتوں میں عمل کرتا ہو، اللہ کی حدود کی حفاظت کرتا ہو، اللہ اور بندے کے درمیان جو عہد ہے اس کو پورا کرتا ہو، تقویٰ کے معاملے میں کسی تاویل کا سہارا نہ لیتا ہو، اپنے تمام معاملات میں احتیاط اور شریعت کے معاملے میں غایۃ احتیاط سے کام لیتا ہو، امت اسلامیہ پر شفیق ہو، کسی گنہگار سے نفرت نہ کرتا ہو، انسانوں سے نرمی سے پیش آتا ہو، گنہگار مسلمانوں کے لیے رحمت اور خیر کی دعا کرتا ہو، اس کی جود وسخا ہر کس وناکس، گنہگار ونیکوکار سب کے لیے کھلی ہو، شکر گذار اور ناشکر گذار سب کے ساتھ اس کا رویہ ایک جیسا ہو، اللہ کی مخلوق کو وہ اپنے خاندان کی طرح اپنی ذمہ داری سمجھتا ہو، ایسا شخص جب بھی موجود ہوگا تو وہ یقیناً دنیا کے معاملے میں زہد واستغناء سے کام لیتا ہوگا، تنہائی کو پسند کرتا ہوگا، شہرت اور پروپیگنڈے سے نفرت کرتا ہوگا، اس کے تمام اعمال کتاب وسنت کے مطابق ہوں گے، اس کا وہ فرشتہ جو بائیں طرف متعین ہے اور اس کے گناہوں کو لکھنے کا پابند ہے اس کے پاس لکھنے کو کچھ ہوگا ہی نہیں، اس لیے کہ اس کے اوقات سب کے سب نیک اعمال میں مصروف ہوں گے، ضائع کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی وقت نہیں ہوگا، اس دور کے فقہاء اور نیک لوگ اس کی خوبیوں کے گواہ ہوں گے اور خاص طور پر اس کو کسی مستند شیخ وقت نے اس کی اجازت دی ہو کہ وہ عامۃ الناس کی تربیت کا فریضہ انجام دے۔

یہ وہ تصور ہے جو ایک مستند اور معتبر شیخ وقت کے بارے میں اکابر صوفیاء نے بیان کیا ہے۔ جہاں مستند اور معتبر مشائخ وقت کی یہ وضاحت اور تفصیل کتب تصوف میں ملتی ہے، وہاں صوفیان خام کا تذکرہ بھی کتب میں موجود ہے۔ خاص طور پر ہمارے برصغیر کے سب سے بڑے مذہبی عبقری حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہمارے زمانے کے جو صوفیان خام ہیں یہ اپنے خام حیلوں کے عمل کو طرح طرح کے بہانوں سے، طرح طرح کی تاویلوں سے درست ثابت کرنا چاہتے ہیں، انہوں نے رقص و سرود کو اپنی ملت اور اپنا دین قرار دے دیا ہے، یہ فضولیات اور لہو ولعب کو اپنی عبادت سمجھتے ہیں، جو شخص فعل حرام کو مستحسن سمجھتا ہو وہ اہل اسلام کے زمرے سے نکل جاتا ہے، اس کا شمار مرتدوں میں ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ سمجھ لینا چاہیے کہ رقص و سرود کی محفلوں کو اچھا سمجھنا اور ان کو اطاعت وعبادت کی ایک قسم سمجھنا بہت بری بات ہے۔ یہ شیخ احمد سرہندی نے لکھا ہے جن کو علامہ اقبال نے ہندوستان کی تاریخ کا سب سے بڑا مذہبی عبقری قرار دیا تھا، جن کو اللہ نے بروقت خبردار کیا جو سرمایہ ملت کے نگہبان کہلاتے ہیں، یہ جملہ انہوں نے اپنی مکتوبات کی جلد اول میں مکتوب نمبر ۲۲ میں بیان کیا ہے۔

یہ مقصد اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے، تصوف خام اور خرافات سے بچنے کا یہ ہدف اسی وقت پایا جا سکتا ہے، جب انسان کی روزی پاکیزہ ہو، اس کی زندگی صاف ستھری ہو اور رزق حلال اس کی توجہ کا مرکز ہو۔ اپنے زمانے کے مشہور بزرگ حضرت ابرھیم ادہمؒ نے کہا ہے کہ اگر تم اپنی روزی پاک صاف اور ستھری رکھو، تو روحانی پاکیزگی تمھیں آپ سے آپ حاصل ہو جائے گی۔ اس کے بعد پھر نہ بہت زیادہ روزے رکھنے کی ضرورت ہے، نہ بہت زیادہ نوافل کی ادائیگی کی ضرورت ہے، رزق حلال خود ایسی برکت اور نور پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں روحانی بلندیاں آپ سے آپ حاصل ہو جاتی ہیں۔ ایک اور بزرگ جن کا تعلق اندلس، دنیائے اسلام کی جنت گم گشتہ، سے تھا۔ یعنی شیخ ابوالعباس مرسی کہا کرتے تھے کہ اگر تم علم شریعت سے وابستگی اختیار رکھو، ایسے علماء کی صحبت میں رہو جو علم اور عمل دونوں کے جامع ہیں اور رزق حلال کی پابندی کرو تو پھر نہ کسی غیر معمولی عبادت کی ضرورت ہے، نہ غیر معمولی زہد و استغناء کی ضرورت ہے، خود بخود تمہیں سب روحانی درجات حاصل ہوتے چلے جائیں گے۔ لیکن اگر کوئی

ایسا شخص ہے جو سالک ہونے کا دعویدار ہے لیکن علوم شریعت سے اعتناء نہیں رکھتا تو ہو سکتا ہے کہ وہ کبائر کا ارتکاب کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو۔ ہو سکتا ہے عجب و ریاء اور نفاق خاموشی سے اس کے دل میں اور روح کی گہرائیوں میں اتر جائے اور علم سے ناواقفیت کی وجہ سے اسے اس کا اندازہ بھی نہ ہو سکے۔

ایسے حضرات کا وجود ہر دور میں غنیمت سمجھا گیا جو شیخ کامل کے مذکورہ بالا اوصاف کا نمونہ تھے، بڑے بڑے اہل علم ایسے حضرات کی تلاش میں رہتے تھے جو تقوی، زہد و استغناء اور عشق الٰہی کی صفات سے متصف ہوں۔ حضرت امام شافعیؒ، جن کا اپنا مقام و مرتبہ بھی روحانیات کے باب میں اتنا ہی بلند و بالا تھا جتنا علم و شریعت کے باب میں، وہ خود تلاش کر کر کے ایسے اولیاء اللہ کی خدمت میں تشریف لے جایا کرتے تھے جن کے بارے میں ان کا خیال ہوتا تھا کہ ان کی خدمت میں بیٹھنا دینی اعتبار سے، روحانی اعتبار سے مفید اور نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا ہے۔ یہی بات امام احمد بن حنبل سے منقول ہے، جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔

تصوف میں بار بار قلب کے احکام کا ذکر ملتا ہے، بار بار روحانیات کا تذکرہ ملتا ہے، ان بیماریوں کا تذکرہ ملتا ہے جو دل سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ بیماریاں یا یہ خوبیاں کیا ہیں، وہ خوبیاں یا وہ اچھائیاں جن کا تعلق دل سے ہے، بعض علمائے اسلام نے ان کو دس عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے:

۱۔ توبہ
۲۔ زہد و استغناء
۳۔ توکل
۴۔ قناعت
۵۔ عزلت
۶۔ دوام ذکر
۷۔ توجہ
۸۔ صبر
۹۔ مراقبہ

۱۰۔ رضا

یہ وہ خوبیاں ہیں جو تصوف پر عملدرآمد کے نتیجے میں ایک مسلمان میں پیدا ہونی چاہئیں۔ اللہ کے حضور توبہ کا رویہ اس کے دل میں پیدا ہو، اپنی سابقہ کمزوریوں اور گناہوں پر ندامت کا رویہ پیدا ہو اور آئندہ تمام غلطیوں اور کمزوریوں سے باز رہنے کا پختہ ارادہ ہو۔

زہد و استغناء سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی مادی نعمتوں اور مادی آسائشوں سے تعلق اور محبت اس نوعیت کی نہ ہو جو اللہ کے ذکر سے غافل کر دے، جو اللہ کی محبت اور اطاعت کے تقاضوں اور آخرت کی جواب دہی کے احساس سے غافل کر دے۔ دنیا سے اتنا تعلق جو دنیاوی زندگی گزارنے کے لیے ناگزیر ہے، دنیاوی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے لازمی ہے، وہ اگر حدود شریعت کے اندر ہو، اور اللہ سے تعلق پر اثر انداز نہ ہوتا ہو، تو وہ ہرگز قابل اعتراض نہیں ہے۔ ایسا تعلق زہد و استغنا کے منافی کبھی نہیں سمجھا گیا۔ اسی طرح توکل، قناعت، ذکر و فکر، صبر و شکر، مراقبہ اور رضا کے احکام کے بارے میں ائمہ اسلام نے خاص طور پر امام غزالیؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، ہمارے برصغیر کے شیخ علیؒ ہجویری، اور امام ابوالقاسم قشیریؒ اور ان جیسے دوسرے حضرات نے تفصیل سے لکھا ہے۔

قلب کے احکام میں جہاں بعض اوامر ہیں جن پر عملدرآمد کرنا لازمی ہے وہاں بعض منہیات بھی ہیں جن سے بچنا ضروری ہے۔ شریعت نے مثلاً غیبت کو حرام قرار دیا ہے، حسد کو حرام قرار دیا ہے، غیر ضروری غصہ اور غیض و غضب کو ناپسندیدہ سمجھا ہے، مال و جاہ کی بے جا محبت سے روکا ہے، بخل سے روکا ہے، عجب اور کبر کی ممانعت کی ہے، ریاء کی ممانعت کی ہے، یہ سب احکام اور نواہی اسی طرح کے ہیں جس طرح سے احکام ظاہریہ میں اوامر و نواہی ہیں۔ جس شریعت نے، جس کتاب و سنت نے، نماز، روزے اور زکواۃ کا حکم دیا ہے اسی کتاب و سنت نے ذکر، توبہ اور انابت اور حب الٰہی کا حکم بھی دیا ہے۔ جس شریعت نے حرام خوری، چوری اور ڈاکے سے روکا ہے اسی شریعت نے حسد، ریاء کبر اور بخل سے بھی روکا ہے، اس لیے جس طرح وہ شریعت کے اوامر و منہیات ہیں اسی طرح سے یہ بھی شریعت کے اوامر و نواہی ہیں اور دونوں پر عملدرآمد کرنا شریعت ہی کا لازمی تقاضا ہے۔

تزکیہ نفس جو تصوف کا دوسرا نام ہے اور تصوف کا سب سے اولین اور سب سے اہم مقصد

ہے اس کا حاصل کرنا آسان کام نہیں ہے۔ کیا واقعی کسی کے نفس کا تزکیہ ہو چکا ہے؟ یہ جاننا خود اپنی جگہ ایک مشکل کام ہے۔ انسانی نفس بہت چالاک اور عیار ہے، وہ عقل کی طرح ہے جو سو بھیس بنا لیتی ہے، اس لیے نفس میں طرح طرح کے بہکاوے بھی پیدا ہوتے ہیں، ادعاءات بھی اس میں پیدا ہوتے ہیں، طرح طرح کی تعلیاں بھی نفس کرتا ہے، اس لیے یہ جاننے کے لیے کہ کیا واقعی تزکیہ نفس ہو گیا ہے؟ یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا بندے نے توبہ کر لی ہے، کیا وہ حقیقی معنوں میں تائب ہو گیا ہے، اگر بندہ حقیقی معنوں میں تائب ہو گیا ہے تو پھر اس کو توبہ کے درجات پر کاربند ہونا چاہیے۔

توبہ کا سب سے پہلا درجہ اس فن کے اکابر کے نزدیک کبائر سے توبہ ہے، پھر صغائر سے توبہ، پھر مکروہات سے توبہ، پھر خلاف اولی امور سے توبہ، اس کے بعد اعلیٰ سے اعلیٰ حسنات کا حصول، جس کی کوئی انتہا نہیں، یہ لامتناہی سلسلہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اکابر اسلام اپنی سابقہ زندگی پر ہمیشہ پشیمان و نادم اور تائب رہتے تھے۔ اس لیے کہ آئندہ کی روحانی ترقیات اور اعلیٰ مدارج کے مقابلے میں جب وہ سابقہ مدارج کو دیکھتے تھے تو ان کو بہت کم اور پست معلوم ہوتے تھے۔ اس پستی میں ان کا کتنا وقت گزرا، موجودہ بلندی سے کب تک محروم رہے اور کتنا محروم رہے، اس محرومیت کی وجہ سے وہ توبہ کرتے تھے اور بار بار اپنے ماضی پر ندامت اور پشیمانی کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔

لیکن یہ احوال و مقامات جن کی کوئی انتہا نہیں ہے، جو لامتناہی ہیں، یہ سب ذوقی اور احساسی امور ہیں، ان کا تعلق داخلی تجربے سے ہے، الفاظ و عبارت سے ان کی حقیقت کی مکمل وضاحت ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص ان مدارج اور احوال و مقامات کو حاصل کرنا چاہتا ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مسلسل کوشش میں مصروف رہے تا آنکہ خود محسوس کر لے اور اس کو تجربہ ہو جائے کہ مدارج اور احوال و مقامات کیا ہیں؟ یہ سب روحانی امور عام انسانی تجربے، زبان و بیان اور عقلی ترازو سے ماوراء ہیں، نہ ان کو بیان کیا جا سکتا ہے، نہ ان کو انسانوں کی زبان میں مکمل طور پر واضح کیا جا سکتا ہے۔

جن لوگوں نے ان تجربات کو اور ان احساسات کو بیان کرنے کی کوشش کی وہ مجاز اور استعارے کے استعمال پر مجبور ہوئے اور یوں ان کی بات کو مکمل طور پر سمجھا نہیں جا سکا۔ جو سمجھ

سکے وہ وہی تھے جو خود بھی اس میدان کے شہ سوار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اکابر اسلام نے ان احوال و مقامات کو دوسروں سے چھپانے کی کوشش کی، کوئی کیفیت یا کوئی مقام جو بندوں کو حاصل ہو وہ اللہ اور بندے کے درمیان ایک راز ہے، اس راز کا اظہار غیروں کے سامنے کرنا یہ غیرت اور مروت کے خلاف ہے، اس لیے اکابر اسلام نے ہمیشہ یہی تلقین کی کہ ایسے تمام احوال و مقامات کو چھپانے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے جو اللہ اور بندے کے درمیان ہوں، یا جن کو بندہ محسوس کرتا ہے۔

تصوف کی دنیا ایک لامتناہی دنیا ہے، تصوف کے مقامات لامتناہی ہیں۔ چونکہ انسانی روح کی استطاعت اور امکانات لامتناہی ہیں، اس لیے روح کی ترقیات سے متعلق جو مقامات و مدارج ہیں وہ بھی لامتناہی ہیں۔ نہ انسانی زبان میں ان کو بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ ماضی میں کسی نے بیان کرنے کی کوشش کی ہے، اس لیے انہی چند صفحات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

۔☆۔